منی لائبریری

لمبی لڑکی

افسانے

راجندر سنگھ بیدی

نیا ادارہ

15/00

افسانے

لمبی لڑکی

راجندر سنگھ بیدی

نیا ادارہ، لاہور

باراول: ۱۹۶۶ء

ناشر: نذیر احمد چودھری

نیا ادارہ۔ لاہور

مطبع: سویرا آرٹ پریس، لاہور

ترتیب

راجندر سنگھ بیدی

گرہن	(افسانے)
دانہ و دام	(افسانے)
ایک چادر میلی سی	(ناول)
کوکھ جلی	(افسانے)
لاجونتی	(افسانے)
اپنے دکھ مجھے دے دو	(افسانے)
مکتی بودھ	(افسانے)

لمبی لڑکی

آخر جب منی سوہی پانچ فٹ آٹھ انچ کی ہو گئی تو دادی رحمتن نے اپنا سر پیٹ لیا۔

"ارے! میں تیرے لئے کہاں سے گھڑا کے لاؤں گی؟" وہ اپنے ڈھائی بال نوچتے ہوئے بولی اور اب کے سچ مچ روتی ہوئی وہ اپنے ڈھیلے ڈھالے بوڑھے اور بیمار پلنگ میں پیچھے کی طرف یوں جا رہی جیسے کلھڑ سے پانی چھلک کر کچی زمین میں کہیں گم ہو جاتا ہے۔

منی سوہی کیا جواب دیتی؟ اس نے پہلے اپنی طرف دیکھا اور پھر بے بسی میں دادی رحمتن کی طرف، جیسے وہ کہہ رہی تھی: اس میں میرا کیا قصور؟ منی تو اپنی لمبان سے آپ ہی شرمندہ تھی، جیسے جوانی کی ناگہانی یورش کے بعد ہر کنواری گھبرا اٹھتی ہے۔ کوئی پوچھے جب پیڑ پر پھل لگتے، پکتے ہیں تو کیا پیڑ گھبرانے، شرمانے لگتا ہے؟

پلنگ کے پاس اخروٹ کی ایک تپائی رکھی تھی جس پر عقیدت کے

زنگوں سے کڑھا ہوا ایرٹیکس کا ایک کپڑا پڑا تھا اور اس کے اوپر پانڈووں کے زمانے کی، پرانے چھاپے کی ایک گیتا جس کے پنے کھلے ہوئے تھے اور ہوا میں اُڑ رہے تھے۔ گیتا ہمیشہ دادی کے سرہانے پڑی رہتی۔ ہاں، دادی کا کیا پتا؟ اب ہو تب نہ ہو! بیاسی برس کی عمر تھی اس کی اور جہاں گھر اور اس نیلی محلے کے لوگوں کی بے آسی بڑھتی جا رہی تھی دادی ماں کی امیدیں جوان ہو رہی تھیں۔ وہ کچھ نہیں تو کم سے کم اتنا ہی اور ـــــ بیاسی سال اور ـــــ جینا چاہتی تھی، جیسے ابھی کوئی سواد نہیں آیا، آیا ہے تو ابھی آیا ہے۔ اس کی دھندلی مگر بے چین آنکھیں نہ معلوم اور کس وچتر گھٹنا کو ڈھونڈتی تھیں؟ منہ کس ذائقے چٹخارے کی تلاش میں تھا؟ اس کا چہرہ پیڑ پر سے گرے ہوئے پیپل کے پتے کی طرح تھا جس میں رگوں اور ریشوں کا ایک جال سا نظر آتا تھا، ہریالی کہیں نام کو نہ تھی۔

دادی رمن کی ہریالی کہیں نہ کہیں ضرور اٹکی ہوئی تھی۔ دورے کے سمے وہ کھانستی، ہوا سے ہوا ہی میں ہوائی تھیلیاں بھرتی، فضا میں پھوہاریں چھوڑتی ہوئی بے دم، بے سدھ ہو کر پیچھے کی طرف لڑھک جاتی، آنکھوں کی پتلیاں اوپر کی طرف سمٹتی ہوئی وہم دوار کو دیکھنے لگتیں، پران پانچ چکروں میں سے نکل کر چھٹے میں چلے آتے، گلے کا

گھنگھرو بجنے لگتا۔ بھابی شیلا پیٹی کوٹ ہی میں بھاگی آتی، دادی کو آخری سواسوں میں دیکھ کر آنکھیں پھیلاتی، چلاتی: "ہائے! کوئی ان کو خبر کر دو۔" منی سوہی دوڑتی۔ روتی، پکارتی ہوئی: "بابو! کہاں ہو؟ دادی گئی!" اور دادی سے لپٹ جاتی۔ "دادی، میں بے ماں کی بیٹی۔ مجھے چھوڑ نہ جانا....."

اور پھر بھابی شیلا اور منی سوہی مل کر گیتا کے سترھویں ادھیائے کا پاٹھ شروع کر دیتیں۔ سماپتی کے بعد اس کا پھل دادی کے نمت دینے لگتیں تاکہ دادی کی جان آسانی سے نکل جائے۔ ایک تو ویسے ہی موت کے وجود کا احساس اس پر آوازوں میں ڈرتا، کانپتا ہوا ترنم ـــــ پوری فضا میں ایک ڈراؤنی، گھناؤنی سی جھنکار پیدا ہو جاتی۔ پھر ایکا ایکی کوئی سنو نیہ، جس سے گھبرا کر منی پکار اٹھتی: "دادی ی ی ی ی" اور اس کی آواز چوکوٹ گونج جاتی۔ جبھی بھابی بڑھیا کے بھاگ ہیں ماتھے، کرم ہیں ہاتھ اور چرنو ہیں شریر پر ہاتھ دوڑاتے ہوئے کہتی: "گئی!" اور پھر "ارے کوئی نیچے اتارو، دیا کرو۔ بے گئی مر گئی تو خرچا کون کرے گا؟ کون پنڈتوں کو روپے پوجے گا؟ سترہ روپے تو آنے تو خالی یہاں سے ہر دوار کا کرایہ ہے....."

اور دادی کو یوں گھسیٹ کر پلنگ پر سے نیچے پھینکا جانا۔

جیسے میلے غلاف کو سرہانے سے اُتار کر دھلائی میں پھینکتے ہیں اسے زمین پر ڈالتے ہی منی سوہی رسوئی کی طرف لپک جاتی اور تھوڑی دیر کے بعد آٹے کا دیا، دیے میں گھی، اور گھی میں رسی لبنی روئی کی بتی اور ہاتھ میں ماچس لئے آتی۔ گھبراہٹ اور ہوا میں جلدی جلدی دو چار تیلیاں پھونکتی ہوئی دیا جلاتی، دادی کو روشنی دکھاتی تاکہ بھنور گھپا میں بھی جائے تو ٹھوکر نہ کھائے۔ ہاتھ پر دیا رکھنے کے بعد منی ڈری سہمی ہوئی ایک طرف کھڑی ہو کر بھابی کی آواز میں آواز ملاتے ہوئے "ہری اوم، ہری اوم" کا جاپ کرنے لگتی اور پھر گائیتری کا سہارا لیتی۔ "اوم بھور بھور سواہ" یا جب شیلا بھابی کو یقین ہو جاتا بڑھیا کے سواس نکل چکے ہیں تو وہ زبردستی کے آنسو بہانے لگتی۔ ہاں، منی کے آنسو سچے موتی ہوتے۔ دادی کے سوا اس کا سہارا تھا کون؟ ماں گئی، اب دادی بھی گئی تو اس کی پرتیت کون کرے گا؟ اس کے اس جھوٹ کی گواہی کون دے گا جو ہر عورت ہر کمزور مرد کو بولنا ہی پڑتا ہے۔ پھر اس کے الھڑ سے تربا چہرے پر کون پردے ڈالے گا؟ شادی تو ہوگی نہیں۔ کون لڑکا دیکھنے کے لئے گلی محلے کے ہر آتے جاتے کے پیچھے پڑے گا؟ پھر اتنا لمبا لڑکا ملے گا بھی کہاں سے؟ چھوٹے قد کا کوئی بیاہے گا نہیں، بیاہے گا تو

بسائے گا نہیں۔ مگر دادی رہے گی بھی تو کب تک؟ اس سنسار کے بھوساگر کی تو کوئی تھاہ ہی نہیں، کوئی دوسرا کنارہ ہی نہیں۔ کون انگلی پکڑے گا؟ کون پار کرائے گا؟

دیو بھیّا ہیں تو اپنی ہی موج، اپنی ہی بہار میں رہتے ہیں۔ سنتے ہیں یہاں سے دو تین بازار پرے اکرم روڈ والے اسپتال میں کوئی نرس ہے، اس کے ساتھ رات جاگتے ہیں۔ پہلے تو گھر آتے ہی نہیں آتے بھی ہیں تو منہ سے، شربر سے بھبھاکے چھوٹ رہے ہیں؛ کچھ شراب کے، کچھ نرس کے۔ یوں بھیّا کو نشہ کم ہوتا ہے پر یہ ثابت کرتے ہیں کہ انہوں نے نشہ کیا ہی نہیں ـــ پکڑے جاتے ہیں۔ ہاں، بن پیسے بھلا کون ہے جو یوں دھیرے دھیرے، ٹکا ٹکا کر پیر زمین پر رکھتا ہے؟ آدمی آدمی ہوتا ہے، کوئی مورتی تو نہیں۔ پھر نہ زیادہ ہنستے ہیں نہ خفا ہوتے ہیں۔ آخر بھابی سے جنگ ہوتی ہے۔ وہ اسے نل کے چو بچے میں پٹخ دیتے ہیں، وہ جھوٹے برتنوں میں سے کانسی کا طبق اٹھا کر ان کے سر پر دے مارتی ہے۔ وہ سوال میں مارتے ہیں یہ جواب میں دانتوں سے کاٹتی، ناخنوں سے نوچتی ہے۔ جانے یہ عورت مرد کا ناطہ ہی مار پیٹ کا ہے۔

پھر برتن گلی میں پھینکے جاتے ہیں جو برتن نہیں رہتے ایک طرح

کا نمونا بن جاتے ہیں۔ کیا بڑے اور کیا چھوٹے ـــ گلی کے سب افراد اس گھر میں آدھمکتے ہیں، بڑی بڑی نصیحتیں، بڑے بڑے بھاشن دیتے ہیں، لڑائی کیا چکاتے ہیں اور جھگڑا بڑھاتے ہیں۔ بھلا لڑائی چکانے میں کوئی اپنی آستینیں بھی چڑھاتا ہے؟ اندر سے وہ کتنے خوش ہوتے ہیں۔ یہ آپ بھی نہیں جانتے۔ پھر کپڑے پھاڑے جاتے ہیں۔ پہلے تو بھابی بے پردہ ہو جانے کے ڈر سے ہار مانتی ہوئی اندر بھاگ جاتی تھی پر ایک دن ایسا آیا کہ وہ سب کے سامنے کھڑی تھی ـــ ننگی! اس پہ دونوں ہاتھ کولھوں پر رکھے ہوئے مجسٹریٹ کی طرح ہے رام! ایک پہراوا بھگوان دیتا ہے دوسرا انسان۔ انسانوں میں رہنا ہے تو ان کا پہراوا پہننا ہی پڑے گا، اور بھابی انسان میں بھگوان کا پہراوا پہنے کھڑی تھی! پڑوس میں جینیوں کے دو خاندان ہیں، شوئیتامبر جین اور ڈگامبر۔ اس دن شوئیتامبروں کی دونوں بہویں آئی تھیں اور شرم سے پانی پانی ہوتے ہوئے بار بار اپنے منہ دھوتی کے پلو سے ڈھک رہی تھیں۔ ان تک بات رہتی تو کوئی بات نہ تھی۔ ڈگامبروں کے سوکھم منی بھی وہیں تھے جو بھابی کے اس رعب داب کو دیکھ کر بھاگے۔ لوگ تو سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگتے ہیں نا؟ سوکھم منی پاؤں پر سر رکھ کر بھاگے، دروازے کی دہلیز کے ساتھ

ٹکرائے، پھر لوٹ کے آئے، پھر گئے اور سو گئے۔ کیڑوں مکوڑوں سے راستہ صاف کرنے والے ان کا بہارو بھی وہیں رہ گیا، ناک کا کپڑا بھی گر گیا۔ نہ معلوم کتنے جیو جنتو ان کے پاؤں تلے آ کر ہنسا ہو گئے ہوں گے اور کتنے ناک کے راستے اندر چلے گئے ہوں گے۔ بھابی کو کتنا پاپ لگا ہوگا! جب سارے جھگڑے بھول کر دیو بھیا اس پر دری پھینکتے، گھسیٹتے ہوئے اندر لے گئے۔

یہی بھابی پہلے بات بات پر مائیکے کی دھمکی دیا کرتی تھی، جھٹ سے لہنگا سنبھالتی، اکا منگواتی اور چل دیتی۔ پرانت میں وہ سمجھ گئی۔ اب اکا نہیں دھکا بھی ملے تو وہ نہیں جاتی۔ کیوں جائے؟ گھر عورت کا ہوتا ہے۔ مرد مسافر اس بات کو کیا جانیں؟ اس کا باہر ہونا ہے اس لئے وہی جائے۔

دوسری طرف باپو ہیں۔ جب پولیس میں ڈپٹی تھے تو کیا کھڑکا ڈر کا تھا ان کا مجال ہے جو گھر میں دیر سے بتی جلے، کھانے میں نمک زیادہ پڑے۔ ایسے میں تھالی سدرشن چکر کی طرح گھومتی ٹنٹناتی ہوئی آنگن میں ہوتی تھی۔ کٹوریوں سمیت، اور ایسی گالیاں سننے میں آتیں جو چوک میں بھی نہ سنی جائیں۔ ادھر ماں گئی، اُدھر باپو کو نہ جانے کیا ہوا۔ ایسی آوری پکڑی جس کی کوئی تھاہ نہیں،

جیسے کوئی بان پر سنتھ لے لیا۔ عورت کا راج اپنے مرد سے ہوتا ہے تو مرد کا بھی عورت ہی سے ہوتا ہے۔ اب وہ صبح سویرے نکل جاتے ہیں اور سیم والی نہر کے پاس، اکھاڑے کی بغل میں ایک بہٹکل، پاکھنڈی مہاتما سے تلسی جی کی چوپائیاں سنا کرتے ہیں یا وہ مہاتما ٹھیک سے ارتھ نہیں کرتے یا بابو اپنے مطلب کا مطلب نکال لیتے ہیں اور پھر اُوذری ہو جاتے ہیں۔ رات گھر آتے ہیں تو چوروں کی طرح پیر سنبھال سنبھال کر زمین پر رکھتے ہوئے گھر بھر میں ڈر کے مارے کوئی ان سے کچھ نہیں کہتا۔ اکثر تو کوئی کھانا بھی نہیں پوچھتا۔ جب بولا کرتا کرتے تھے تو کوئی جواب بھی دیتا تھا۔ اب وہ چپ ہیں تو سارا سنسار چپ ہے۔ سب ہی اس بات سے ڈرتے ہیں کہ بان پر سنتھ لیا تو سنیاس بھی لے سکتے ہیں۔ پھر پنشن گھر میں نہ آئے تو گزارہ کیسے ہوگا؟ بھیّا کی سائیکلوں کی دکان تو چلتی نہیں۔ نرس کے لئے جو بیچ میں گول مال کیا تھا اس کے کارن ایک دن بیٹھے بٹھائے ان کی ایجنسی بند ہو گئی۔

بھیّا یوں نہیں آتے، بابو گھر میں نہیں رہتے۔ اب یہاں عورتوں کا راج ہے۔ ہم عورتیں سبھی راج کی اچھا کیا کرتی ہیں پر جب مل جاتا ہے تو سر پیٹ لیتی ہیں: نا بابا! ایسا راج کسی کو نہ ملے۔ وہ

گھر ہی کیا جس میں مرد نہ آئے، حکم نہ چلائے، ہر روز کوئی نیا جھگڑا فساد نہ مچائے۔ عورت بیرن آخر تو مرد ہی کے نام سے جانی جاتی ہے۔ مرد کیا ہے؟ دادی سے پوچھو، بھابی سے پوچھو، سامنے والے شاہد میاں کی آپا سے پوچھو، مجھ سے.... پر میرا تو وہ آئے گا ہی نہیں۔ آئے گا بھی تو چلا جائے گا۔ نیا گی جات کی ہم عورتوں کی قسمت ہی ایسی ہے۔

جبھی شیلا بھابی کو دادی ماں کا ماتھا گرم دکھنے لگتا۔

"یہ تو" وہ ماتھے پہ ہاتھ مارتے ہوئے کہتی، "جی رہی ہے"۔

منی سوہی جھپٹا کے لمبے لمبے ہاتھ پیر مارتی ہوئی سوچ بچار کے ہچکولوں سے نکلتی اور لپک کر دادی کے ماتھے پر ہاتھ رکھ دیتی جو اسے اپنی جوانی اور اس کی گرمی کے کارن ویسے ہی برف کا برف معلوم ہوتا اور پھر تھوڑا گرم۔ جبھی دادی کا کانپتا ہوا ہاتھ زندگی کی تائید میں اُٹھ جاتا: سوہی مری مری جی اُٹھتی، شیلا جیتے جی مر جاتی۔

"دادی کو اوپر ڈالو، شیلا بھابی۔" منی چلاتی۔

بھابی ماتھے پر سات ٹھیکرے پھوڑتی ہوئی کہتی۔ "تم ڈالو تو ڈالو، مجھ سے نہیں اٹھائی جاتی یہ گیلی لکڑ۔"

منی اپنے لمبے چوڑے کلاوے میں دادی کو اٹھاتی اور پھر سے پلنگ پر لٹا دیتی۔ کوئی ہی دیر میں رحمن بولنے جوگی ہو جاتی ہوش میں آتے ہوئے جس پہلے شبد کا اُچار سنا کرتی۔ وہ "منو" ہوتا جس کے جواب میں منی بھی ہمیشہ بڑھیا کو پچکارتے ہوئے بول اٹھتی "ددیا!" جبھی ایسا معلوم ہونے لگتا ہے جیسے دادی منی ہے اور منی دادی۔ دراصل منی اور دادی ایک دوسری کی طرف چلتی ہیں تو بیچ میں کہیں ایسے موڑ، ایسے نکڑ پہ مل جاتی ہیں۔ جہاں ماں کھڑی ہوتی ہے جو کبھی اپنے آپ بوڑھی ہو جاتی ہے اور کبھی بچی۔ بچی ہو یا بوڑھی عورت سے ماں بننے کا الزام تو ٹل ہی نہیں سکتا۔ وہ اس کے مل موت میں جیتی، اسی میں مر جاتی ہے اور مرد وے یہی سمجھتے ہیں: اس کی آئی تھی اس لئے چلی گئی۔

"تو نے مجھے پکارا نا۔" دادی منو سے پوچھتی۔

"نہیں تو،" منی جواب دیتی، "میں نے تجھے نہیں پکارا،"

دادی سرزنش کے انداز میں انگلی اٹھاتے ہوئے کہتی:

"دیکھ، میں نے تیرے باپ کو جنا ہے۔" اور پھر "میں سب جانتی ہوں تیرے چلتر۔ عورت میں چار سو چار چلتر ہوتے ہیں پر تجھ میں چار سو پانچ ہیں۔"

اس پیاری سی پھٹکار کے بعد منی تھوڑا اور بھی دادی کے پاس سرک آتی: "تیری ہوں دادی" اور پھر ایکا ایکی منی کو یاد آجاتا:۔ ہاں ہاں، بےبس ہو کر دادی کو آواز دی تھی، شاید یہی آواز تھی جو کھنڈروں بر ہمنڈوں کو چیرتی ہوئی دادی تک جا پہنچی اور اسے پھر اس سنسار میں لے آئی۔ پر منی جانتی تھی اوپر جاتی ہوئی دادی بھی تو مڑ مڑ کر نیچے دیکھتی ہوگی۔ وہ جانا نہیں چاہتی تھی، ابھی کچھ کام تھے جو ادھورے رہ گئے تھے، جنہیں وہ نبٹانا چاہتی تھی۔ منی آخر مان جاتی

"ہاں، دادی! میں نے پکارا تھا۔ میری اور سنتا کون ہے؟"

گلی محلے کی کچھ عورتیں مزاج پرسی کے لئے آجاتیں۔ شیلا بھابی کچھ دیر کھڑی رہتی اور پھر دادی پوتی کے بیچ یہ انوکھی عشق بازی دیکھ کر ناک بھوں چڑھاتی ہوئی اندر رسوئی بھنڈارے کی طرف چل دیتی

دادی رتمن پھر اٹھنا چاہتی۔ بڑھاپے میں اور تو سب چیزیں انسان اُٹھا لیتا ہے پر اپنے آپ کو اٹھانا بڑا مشکل ہے۔ اصل میں بوجھ شریر کا نہیں ہوتا من کا ہوتا ہے۔ دادی، جو کوئی ہی دیر پہلے مر رہی تھی، عورتوں کی مدد لینے سے انکار کر دیتی، منی کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو بھی جھٹک دیتی اور اُٹھ کر بیٹھ جاتی اور منی کی طرف دیکھتے ہوئے کہتی۔

"یہی میری دشمن ہے، گلو کی ماں"

گلو کی ماں قریب ہوتے ہوئے پوچھنی۔ "کیوں ماں، منی کیسے دشمن ہو گئی؟"

"میں اچھی بھلی جا رہی تھی،" دادی رقمن کہنی، "اس ہٹرنی نے نہ جانے دیا۔"

پیار سے دی ہوئی اس گالی سے منی کے سارے چھوٹے موٹے ڈر، سب دکھ دلدر دور ہو جاتے۔ ایسے میں دادی دشمن کی بجائے منی کو سجن کہہ دیتی تو کیا ہوتا؟ پھر دادی کو وہ سارے درش یاد آ جانے جو اس نے تھوڑی دیر کی موت میں دیکھے تھے۔

"کتنی سندر باٹکا تھی، جمنا!" وہ سامنے دیکھتے ہوئے کہنی، جیسے اب پھر باٹکا دکھائی دے رہی ہو۔ "پھول اور ہری بھری بیلیں، اور ان بیلوں میں پھول، ان پھولوں میں پرکاش، جس میں بڑے بڑے رشی منی بیٹھے اکھنڈ کیرتن کر رہے تھے۔"

گلو کی ماں جمنا، منی ـــ سب شردھا سے سننے لگتیں۔ دادی کبھی آہستہ کبھی تیز انند کا سب وگیان لٹانے لگتی۔

"کروڑوں سورجوں کا اجیالا، پھر گرمی نام کو نہیں ایسی ٹھنڈک جو دکھ درد سے وکھ من کو ہرا کر دے، ایسا سکھ پہنچائے جو کہنے میں

نہ آئے۔ بس ایک ہی آگ تھی جو بار بار میری اور لپک رہی تھی۔"

"آگ؟ آگ کیسی ماں؟"

دادی منی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتی۔ "اس پتوتی کی آواج...."

جمنا بول اٹھتی۔ "پر آواز تو شبد ہوتی ہے، دادی...."

"مورکھ ہونا،" دادی جھلا کر جمنا سے کہتی، "اتنا بھی نہیں معلوم۔ انتر ہیں شبد اور پرکاش میں کوئی بھید نہیں ہوتا۔"

"دھنیہ ہو۔" جمنا کہتی اور دونوں ہاتھ جوڑ کر نمسکار کر دیتی۔

"دھنیہ ہو دادی۔" باقی کی بھی پکار اٹھتیں۔

اور پھر دادی برابر بولتی جاتی، جیسے کوئی چابی لگ گئی یا جیسے کوئی دیر پہلے کی چپ کا گھاٹا پورا کر رہی ہو۔ پھر اس عمر میں، جب کوئی کسی کی نہیں سنتا، جمنا اور رگلو کی ماں کے سے شردھالو مل جائیں تو اور کیا چاہیئے؟ ان سب کو زور زور سے سر ہلاتے دیکھ کر منی ڈر جاتی۔ پہلے بھائی اور بھابی کے جھگڑے کے کارن گھر بھر لوگوں کی آمد جار کا بر بتیاں بنا ہوا تھا۔ اب دادی کے دیوی بن جانے کی وجہ سے جب اور بھی عورتیں آنے لگتیں تو چار سو پانچ چلتر والی منی دادی کی بات کاٹ دیتی۔

"اچھا دادی، وہاں سرگ میں تجھے دادا نہ ملے؟"

ایکا ایکی دادی کے ڈال پر سے گرے ہوئے سوکھے پتّے کی رگوں اور ریشوں میں ہریالی دوڑ جاتی اور نو بیاہتا کی طرح وہ شرماتے ہوئے کہتی: "ملے کیوں نہیں ری منی۔" یک دم پانسہ پلٹ جاتا۔ وہی عورتیں ایک دوسرے کے کوہلے میں ٹھوکے دینے لگتیں اور اشارے میں کہتیں:

"سُنو! سُنو!"

"تب وہ کیا بولے؟" منی پوچھتی۔

"پیڑوں کی لسی مانگ رہے تھے۔"

منی جمنا اور گلو کی ماں اور دوسری عورتوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہتی: "دادا جی کو بہت پسند تھی پیڑوں کی لسی۔" اور پھر دادی سے بولتی: "کیا وہاں سرگ میں پیڑے بھی نہیں دیا؟"

"پیڑے بھی نہیں، کھٹّی کڑھی بھی نہیں۔"

کھٹّی کڑھی دادی کو بہت پسند تھی!

"ایسے سرگ میں جانے کا کیا فائدہ؟" منی کہتی۔

"وہی تو۔" دادی اپنے بھول پنے میں جواب دیتی، "کل تم دیول کے پجاری جی کو نیوتا دینا اور ساتھ پنڈت ریلا رام کو بھی

خوب کھانا کھلانا اور پیٹ بھر کے پیڑوں کی لسّی پلانا۔"
عورتیں اپنی ہنسی دبائیں، منی کہتی۔ "ہاں دادی، یہ کوئی سرگ تھوڑے ہے۔ جہاں پیڑے بھی نہ ہوں۔"
اور دادی سامنے دیکھتے ہوئے بولتی جاتی: "کیسے سامنے آکر کھڑے ہو گئے۔ سندر کے ہیروں جواہروں سے جڑے تھے، مگر تنے چوکھٹ ہیں، ویسے ہی شبیر جوان۔ یہ چوڑی چکل چھاتی، لٹ لٹ کرتا ہوا چہرہ! اس پر یہ بڑے بڑے مونچھوں کے کالے گچھے۔۔۔۔"
عورتیں!
"کالے گچھے؟" منی کہتی، "ابھی تک ان کی مونچھیں کالی ہیں؟"
دادی پوپلے منہ کے ساتھ تھوڑا ہنس دیتی، "پاگل ہے؟
کال بھگوان کی مار وہاں تک نہیں پہنچتی، منو۔ وہاں جوان بوڑھے نہیں ہوتے۔ میں نے دیکھا ان کے پاس ایک سندر، سجل لڑکی تھی۔ کیا روپ تھا اس پر۔۔۔۔"
"کیا بات کر رہی ہو ددیا؟" منی بول اٹھتی، "وہاں بھی دادا۔۔۔"
"ہاں۔ یہ بھی تو پوچھ وہ تھی کون؟"
"ک۔۔۔۔کون؟"
"وہ میں تھی ——— جب بیاہی آئی تھی۔"

اس پر سب ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہونے لگیتں۔ ان کی ہنسی
نہ سُنائی دیتی۔ دادی کو اور وہ کہے جاتی: "میرا ہاتھ پکڑ کر بولے:
'تم آجاؤ، رمن، اب نہیں رہا جاتا۔'"

یہ عورتوں کے صبر کی حد تھی!

دادی بولتی: "میں نے ہاتھ چھڑا لیا، کہا: 'میں ابھی نہیں آسکتی۔'
جگن کے پتا! ابھی کوئی دیر اور میری راہ دیکھو۔ مجھے دنیا میں بڑے
کام ہیں۔" اور دادی کے چہرے پر کی نہروں اور جھیلوں میں جھر
جھر بہتے پانی کو دیکھ کر عورتیں ایک دم چپ ہو جاتیں۔ دادی ایک
ہاتھ تپائی پر پڑے ہوئے گیتا پہ رکھ دیتی اور دوسرے سے دھوتی
کا پلو تھامتی، آنکھیں پونچھتی ہوئی ایک جیوتی ہین نگاہ منی پر
ڈالتی اور بلبلا اُٹھتی:

"ہائے ری سوہی، تو کیسے سوہے گی؟"

اسی ایک ہی بات میں باقی کی عورتوں کا اندر بھی پانی ہو کر آنکھوں
میں چلا آتا۔ آخر وہ اُٹھتیں، ہاتھ جوڑ کر نمسکار کرتیں، "دھنیہ ہو"
"دھنیہ ہو ماں"، کہتی ہوئی ایک ایک کر کے چل دیتیں۔

جگن ناتھ نیاگی اور ان کے بیٹے دیویندر نیاگی کے مکان ڈیٹی

بھون میں کالے بھی آئے اور گورے بھی آئے پر منی سوہی کے رنگ کا ایک نہ آیا، اس کے قد کاٹھ کو کوئی نہ پہنچا۔

منی سوہی خالی خولی لمبی ہی نہ تھی۔ بدن بھی بھرا ہوا تھا اور رنگ اپنے ہی لہو کی آگ میں جلتے رہنے سے تانبے کا سا ہو گیا تھا کبھی تو وہ کونارک کے مندر کی ناتانترک شلپیوں کے ہاتھ سے بنی ہوئی، بڑی سی یکشی معلوم ہونے لگتی اور کبھی ایک بڑی سی دیگ بیاہ شادیوں میں جس میں حلوہ یا آڑد پکائے جاتے ہیں اور جس کے نیچے برابر کی آنچ کے لئے منوں ہی لکڑیاں ڈالنی پڑتی ہیں، اور پھر کیا حلوہ بنتا ہے، کیا آڑد ہوتے ہیں! گلی بازار میں نکلتی سوہی تو اپنے آپ سے بھی ایک فٹ آگے چلتی، جیسے کہہ رہی ہو: ہٹ جاؤ، میں آ رہی ہوں۔ لوگ راستہ دے دیتے، پچھاڑیں کھا کھا کر پیچھے گرتے، جیسے ڈیٹی جگن ناتھ کی نہیں کسی راجہ کی بیٹی آ رہی ہو!

نباگی کل کی سب بیٹیاں ایسی ہی ہوئیں، چھ چھ فٹ کی، اور بیٹے چھوٹے اور بے بضاعت سے۔ سب بیٹیوں کی شادی میں یہی مصیبت ہوئی، یہی کھلبلی۔ اوپر تین چار پشت میں کوئی ایسی بہو آئی کہ پورے کل کی نباہی لے آئی: ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ رکنے

کا نام ہی نہ لیا۔ دادا پہلے آدمی تھے جنہوں نے خاندان کو اس بربادی سے بچانے کی کوشش کی: دادی چھوٹے قد کی لائے، مطلب اپنی بیوی، منی کی دادی۔ خود منی کی ماں بیچ کے قد کی تھی۔ دبوبندر کی بیوی شیلا بھی ناٹی بلکہ بونی۔ دادا کے حساب سے اس پشت میں اولادوں کے ٹھیک ہونے کی امید تھی۔ پر شیلا نے موتی تو دبوچ ہی لئے، لعل بھی نہ اُگلا۔ سب ڈرتے بھی تھے نا کہ بیٹیاں چھوٹے قد کی ہوئیں تو بیٹوں کا کیا ہوگا! پر اس وقت تو منی کا سوال تھا جواب پانچ فٹ نو انچ کی ہو گئی تھی۔

کئی گرمیاں آئیں اور گئیں، کتنی سردیوں نے شل کیا، بہاریں گئیں اور پت جھڑیں بھی، سامنے شاہد بھیّا کے مکان کے پاس جو کچنار کا پیڑ لگا تھا اس نے کئی ہرے اودے کوٹ پہنے اور اتار بھی دیئے، ڈپٹی بھون کے باہر، بڑھاؤ کے نیچے، جو شہتیری ڈالی تھی اس میں جویاں بھی چلی آئیں، برسات آٹھ آٹھ، سولہ سولہ بتیس بتیس آنسو روئی اور نئے مکانوں پر ہری اور کالی کائی چھوڑ کر جیسے اپنی سسرال چلی گئی — پر منی وہیں تھی: نیلی محلے کی رونق، شام گلی کا مذاق۔ اب کے سال جو گرمی پڑی تو حد ہی ہو گئی۔ برسوں میں ایسا امس کبھی نہ ہوا تھا۔ جمنا کی دونوں کناروں کا

دُودھ تھنوں میں سوکھ گیا۔ پہاڑوں پر چلے جانے کے کارن گلو کی ماں کے گھر اُلو بولنے لگے، دن کی روشنی میں اُڑنے لگے۔ دھرتی سے غبار اُٹھتے، اور اپنے دماغ، آسمان پر چھا جاتے۔ بادل آتے بھی تو گرجے برسے بنا ہی نکل جاتے، جیسے کسی بگیا کی سیر کرنے آئے ہوں۔ ایک دھول سی تھی جو ہر وقت چھائی اور عقل کو ماؤف کئے رہتی۔ اس مٹی اور گرد سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دھرتی آسمان کی طرف اُچھل رہی ہے اور آسمان دھرتی کی طرف لپک جاتا ہے۔ اس حبس اور حبس میں ایسی لپک جھپک سے یہ پتا چلتا جیسے پوری کائنات کو اختناق ہو رہا ہے۔

اور نوا ور آپا فردوس، شاہد کی بہن، جو دو سال سے بھائی کے گھر بیٹھی تھی، چلی گئی۔ دولہا بھائی نے پیر پکڑے، معافیاں مانگیں، توبہ میں کان لال کیے اور آپا کو لے گئے۔ شاہد کوئی ایسے ہی تھوڑے بھیجنے والے تھے! بیچ میں اس قاضی کو بھی لے آئے جس نے نکاح پڑھوایا تھا اور حق مہر باندھا تھا۔ آپا فردوس کے رخصت ہوتے وقت منی اتنا روئی کہ تالاب بھر گئے۔ آپا نے بہت پیار کیا، بہت تسلّی دی اور کہا: ”میں پھر آؤں گی، منو — تیری شادی پر تو انشاالله ضرور آؤں گی۔“ منی سو ہی نے فریاد

نظروں سے آپا فردوس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "تب تو نو نہ آئے گی آپا!"

ڈگامبروں کی بھونڈی میک باتی نے کہا: "سہیلی کے جانے پہ ٹھوڑی کوئی اتنا روتا ہے؟" جب منی نے اپنے آنسوؤں کو خون بنایا اور پی گئی۔ پردادی تھی جو خون کو آنسو بناتی رہتی۔ شیلا اب اس سے تنگ آچکی تھی، اس لئے بھی کہ دادی اب پلنگ ہی پہ چادر گیلی کر دیتی۔ دیوبندر کتنا بھی شرابی کبابی تھا مگر مگر دادی سے پیار کرتا تھا۔ پیار مردوں کو بسنا پڑتا ہے اس لئے کہ مرنا نہیں پڑتا بس خالی خولی ہمدردی جتائی، دنیا کی نظروں میں، اپنی نگاہوں میں اچھے بنے اور چل دیئے۔ دادی کے پلیت کئے ہوئے کپڑے منی دھوتی تھی۔ اس پہ بھی شیلا ناک پہ دوپٹہ رکھے ہوئے اندر آئی، باہر جاتی۔ دیوبندر کو یہ نظارہ بہت نک چڑھا معلوم ہوتا۔ ایک دن وہ بولا:

"تم چاہتی ہو دادی مر جائے؟"

"ہاں۔" شیلا بے جھجک بولی۔

"اس کا ایک ہی طریقہ ہے۔"

"کیا طــریقہ؟"

دمنی کا بیاہ کر دو۔"

شیلا سٹپٹا گئی۔ "میں تو کہتی ہوں دادی بھی جائے اور اس کی پوتی بھی۔ مجھ سے اب کسی کے مرانے نہیں مرے جاتے۔" اور وہ پھر بولی، "دکل بہن تمہاری اونچی ایڑی کا جوتا دیکھ رہی تھی۔ میں تو کہتی ہوں پہنے، سر بادلوں میں سمائے، کہیں اوپر کی اوپر چلی جائے۔"

دیویندر چپ رہا۔

"اور نہیں تو کیا،" شیلا پھر بولی، "دونوں کے لئے جم راج مجھے ڈھونڈنے ہیں؟"

جم راج ڈھونڈنے کی ذمے داری چونکہ دیویندر کی تھی اس لئے وہ کچھ نہ بول سکا۔ وہ طبیعت ہی سے کام چور تھا۔ ہر قسم کی ذمے داری سے گھبراتا تھا۔ جو کام اپنے آپ ہو جائے سو ہو جائے۔ اپنے پتا جگن ناتھ کی طرح وہ بھی اپنی اس کاہلی اور بے عملی کے سلسلے میں شاستروں اور پرانوں کی مدد لیتا۔ مالس کا سب جتن چنتا ہی ہے۔ بھگوان نے کہا ہے تم پورے طور پر اپنے آپ کو میرے حوالے کر دو، تمہارے سب کارج سدھ ہو جائیں گے۔"

کام ہوگا یا نہیں ہوگا، اس لئے پچاس فیصد کے تناسب سے

ایسے لوگوں کے کارج سدھ ہو بھی جاتے ہیں۔

دیویندر برآمدے سے اٹھا۔ صحن میں آیا، ایک نظر آسمان کی طرف دیکھا جہاں بادل گھر آئے تھے۔ کیوں نہ آتے؟ یہ موسموں کا چکر بھی ایک سائیکل ہوتا ہے۔ سردی کے بعد گرمی، گرمی کے بعد برسات۔ اُوپر بھی کبھی کسی گول مال سے ایجنسی بند ہو جاتی ہے۔

اُدھر برسات کی پہلی بوند گری ادھر گوتم، دیویندر کے بچپن کا دوست، کلکتے سے چلا آیا جہاں اس کے پاس ہند سائیکلوں کی ایجنسی تھی اور اب یہاں، دینا پور میں، سب ایجنسی قائم کرنے آیا تھا۔

گوتم قد کے اعتبار سے مشکل سے پانچ فٹ دو انچ کا ہوگا لیکن تن و توش کے اعتبار سے اچھا تھا۔ آکا باکا سا چہرہ، لال رنگ معلوم ہوتا تھا گالوں میں دو ٹماٹر دبا کے رکھے ہیں، بات بات پر اُچھلنا، جیسے نہ جانتا ہو اس صحت کا کیا کرنا ہے۔ دیویندر نے گوتم کو چائے پر گھر بلایا۔

شیلا کے کان گوتم کی باتیں سُنتے سُنتے پک گئے تھے۔ لیکن اس نے اسے دیکھا نہ تھا۔ شاید اس سے پہلے گوتم اس گھر میں کبھی آیا بھی نہ تھا، اس لئے بھابی تو سپنے میں بھی نہ دیکھی تھی۔ شیلا اسے یوں

تپاک سے ملی جیسے برسوں سے جانتی ہو۔ دیویندر نے شیلا کو چائے لانے کے لئے کہا اور پھر اُٹھ کر اس کے کان میں کھسر پھسر کرتے ہوئے اندر بھیج دیا۔

بس یہی غلطی ہوئی۔ شیلا اندر گئی تو چائے بناتے ہوئے منی سے کہہ دیا: "منی اندر بیٹھک میں نہ جانا۔"

"کیوں؟" منی نے پوچھا، "وہ آ گئے، بھیا کے . . . . "

"ہاں۔"

اور پھر شیلا خود کیتلی و نیلی نکالنے لگی۔

بھابی منع نہ کرتی تو شاید منی کو کچھ نہ ہوتا لیکن اب اس کے تن بدن میں کوئی آگ سی لپک آئی۔ وہ اب اس حالت کو پہنچ گئی تھی جس میں لڑکیاں آنکھیں بند کر کے صرف آوازیں سُنا کرتی ہیں اور پھر بے دم ہو کر گر جاتی ہیں۔ منی سوچی کے لئے شاید آواز کافی نہ تھی۔ بھابی کے اندر جاتے ہی وہ برآمدے کی طرف لپکی اور سیڑھیوں پر سے ہوتی ہوئی بام چھتے پر جا پہنچی جہاں ایک روشندان بیٹھک کے اندر کھلتا تھا۔

شیلا ٹرے میں چائے اور کچھ دال موٹھ وغیرہ لئے بیٹھک میں آئی، دیویندر نے اُچھلتے ہوئے کہا۔ "ٹھہرو، میں کچھ پیڑے

لے آؤں۔"

"ارے نہیں بھائی۔" گوتم نے روکا۔

"ایک منٹ میں آتا ہوں۔" دیویندر نے کہا، "میں جانتا ہوں تم پیڑے بہت پسند کرتے ہو۔" اور اس سے پہلے کہ دیویندر کو کوئی روکے وہ نکل گیا تھا۔

منی روشندان سے دیکھ رہی تھی۔ گوتم آگے بڑھ بڑھ کر بھابی شیلا سے دیور کا رشتہ جگا رہا تھا۔ دیور بھابی کا رشتہ جو ایک طرح سے ہر دیور کے لئے شادی کی ریہرسل ہوتا ہے جس میں ادب کی حد سے پرے اور ننگے پن کی سیما سے ورے کی باتیں ہوتی ہیں۔ بھابی چیز بھی ایسی ہوتی ہے کہ اس کی ہر لٹس، اس کا ہر پور چھیڑنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ گوتم شیلا سے کہہ رہا تھا: "کوئی زور لگاؤ بھابی، ایک بیٹا جن دو، نہیں تو یہ بھیّا میرا دوسری شادی کر لے گا۔"

دیویندر ابھی آئے نہیں تھے۔ بھابی نے دال والی پلیٹ سامنے رکھ کر چاسئے انڈیلی اور کہا: "ہاں دیور جی، یہ کہہ بھی رہے تھے۔"

"کیا کہہ رہے تھے؟"

"یہی کہ اگلی بیساکھی تک کچھ نہ ہوا تو یہ دوسرا بیاہ کر لیں گے۔"
اور شیلا نے جان بوجھ کر منہ پرے کر لیا۔ جیسے رونے لگی ہو۔
گوتم لپک کر اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا: "سچ بھابی؟" اور
اس کے ہاتھ ان جانے ہی میں آستینیں چڑھانے لگے۔ جبھی اسے
ایک کھلی سنائی دی۔ بھابی ہنس رہی تھی!
گوتم سمجھ گیا، ایک تسکین کی سانس لیتے ہوئے بولا:......

"اوہ بھابی! تو نے تو میری جان ہی نکال لی۔" اور پھر چارپائی
پر دھم سے بیٹھ گیا جو صوفے کے طور پر استعمال کی جاتی تھی۔
بے وقوف تو گوتم بن ہی گیا تھا لیکن اس ہزیمت سے بچنے کے
لئے برابر ہاتھ پیر مارتا رہا۔ ظاہر ہے گھر آنے سے پہلے دونوں دوستوں
میں کچھ تو راز و نیاز کی باتیں ہوئی ہوں گی۔ چائے کی پیالی تھامے
ہوئے وہ شیلا کے قریب ہو گیا اور کان کے پاس منہ کرتے
ہوئے بولا: "مذاق کی بات نہیں بھابی، سُنا ہے۔ دیویندر بھیّا
نے ایک نرس رکھی ہے!"
شیلا کے من میں آگ کا ایک بھبھاکا سا اٹھا۔ سارے بدن میں
آگ لگ گئی۔ اب وہ نہ مذاق کر سکتی تھی اور نہ سن سکتی تھی اس
کے واہمہ کو جو ٹھیس لگی تھی اس میں اس نے گوتم ہی کا تختہ کر دیا۔

ایک دم ناک پھلاتے ہوئے بولی: "ٹھیک ہے، مرد ہے تو رکھنا ہے نا! اور کیا تم ساچرہا عورت رکھے گا؟"

دیو بندر پیٹر سے لے کر آیا تو گوتم رومال سے اپنے ماتھے پر سے پسینہ پونچھ رہا تھا!

منی کی تلاش میں دادی رقمن گھسٹتی ہوئی نیم چھنے پر آئی تو دیکھا منی بے ہوش پڑی ہے۔ دادی نے سر پیٹتے ہوئے آوازیں دیں۔ شیلا آئی، پھر گلو کی ماں اور سب نے مل کر ایک چمچے سے منی کی دندن کھولی، ہاتھ اور پیر مل کر سیدھے کئے۔ بڑا ڈراما ہونا مگر گوتم جب تک رخصت ہو چکا تھا۔

بچی بچی جگہ، سایہ آسیب کی باتیں ہونے لگیں لیکن بھینتر سے سب جانتی تھیں یہ سب کیا ہوا؟ کیوں ہوا؟ منی ہوش میں آئی تو شرمندہ تھی، اپنے آپ سے شرمندہ۔

"نہ جانے مجھے کیا ہو جاتا ہے؟" وہ بولی اور دادی کی گود میں سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

شام تک منی ٹھیک ہو چکی تھی اور گھر کا کام کاج کر رہی تھی۔ آج شیلا نے سبزی اور دال دونوں میں غلطی سے دو بار نمک ڈال دیا تھا۔ اب وہ اور منی دونوں ڈر رہی تھیں۔ باپو آئے تو کیا

ہوگا؟ وہ تو عام نمک سے بھی کم پسند کرتے ہیں! کہیں پرانے جلال میں آئے تو تھالی کٹوری سب باہر پٹخ دیں گے۔

رات بابو آئے۔ ہمت کر کے منی نے کھانا پروسا اور بابو نے کھانا شروع کیا۔ شیلا اور منی دونوں کی آنکھیں بابو کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ پہلا ہی گراس بابو جی کے منہ میں رکھا، پھر انہوں نے یوں اندر نگل لیا جیسے روٹی نہیں حلوہ کھا رہے ہوں۔ شیلا نے معذرت کرتے ہوئے کہا:

"آج نمک کچھ زیادہ ہی پڑ گیا ہے، بابو جی۔"

بابو جی نے ایسے کہا جیسے انہیں کچھ پتا ہی نہیں، بولے: "نہیں تو بٹیا، نمک تو ٹھیک ہے، بالکل برابر ہے۔"

دو چار نوالے اور منہ میں ڈالتے ہوئے بولے: "دراصل آج مجھے بھوک ہی نہیں ہے۔ جہاں نما جی نے دھرا پرساد دے دیا نا۔"

منی نے اپنی آنکھیں پونچھیں اور دوڑ کر جمنا کے ہاں سے تھوڑی دال لے آئی اور بابو کے سامنے رکھی۔ بابو جب نک تھالی پر سے سرکا چکے تھے۔ شیلا اندر بستر ٹھیک کرنے کے لئے چلی گئی تھی منی نے کٹوری تھالی میں رکھ کر اسے قریب کرتے ہوئے کہا "کھانا پڑے گا، بابو جی۔"

باپوجی کو بھوک تو لگی تھی، چپکے سے نوالہ توڑ کر دال میں بھگوتے اور منہ میں رکھتے ہوئے اندر کی طرف دیکھا اور بولے: "بہو کیا کہے گی؟"

دوسرے دن گوتم کو آنا تھا — لڑکی دیکھنے!

منی کو تو کوئی امید نہ تھی۔ بھابی نے جو اس کی درد شا کی تھی اس کے بعد تو کوئی بھی مرد اس گھر میں نہ گھسنا، پر اس کا نتیجہ اُلٹا نکلا بھابی کے شبدوں نے گوتم میں کا مرد اور بھی نندی سے جگا دیا۔

بیٹھک میں آج باپو تھے، دیویندر بھی اور دادی بھی منی کو سادہ مگر خوبصورت کپڑے پہنا کر ایک طرف بٹھا رکھا تھا اور اسے کڑی ہدایت تھی کہ اٹھے نہیں ورنہ سب معاملہ چوپٹ ہو جائے گا۔

گوتم آیا۔ اس کی پگڑی کو بہت کلف لگا تھا۔ شملہ سر پر ایک فٹ اوپر اُٹھا ہوا تھا اور اپنے ناٹے قد کے باوجود وہ لمبا معلوم ہو رہا تھا۔ آتے ہی اس نے منی کی طرف دیکھا اور سمجھ گیا۔ منی کی محجوب نگاہیں زمین پر گڑی ہوئی تھیں اور اندر ہی اندر وہ کانپ رہی تھی ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو رہے تھے۔

ایکا ایکی گوتم کچھ اُکھڑی اُکھڑی باتیں کرنے لگا، پھر اس نے منی کی طرف دیکھا اور دیویندر سے بولا: "بھیّا، تم بھی پانی پیو گے؟"

"ارے ارے! پانی کیوں؟" دیویندر نے کہا، "کوئی شربت لاؤ شیلا۔"

شیلا کی بجائے خود حکم لینے کی عادی منی ایکا ایکی اٹھی۔ دادی نے دھپ سے ایک ہاتھ منی کے سر پہ مارا۔

"بیٹھی رہ، تو کہاں جا رہی ہے؟"

اور منی جو آدھی ہی اٹھی تھی بیٹھ گئی، لیکن آدھی ہی میں وہ ساری معلوم ہو رہی تھی۔ اسے کچھ یاد آیا، کچھ بھول گیا۔

اس شام محلے بھر کے منہ میٹھے ہونے لگے، بدھائیاں ملنے لگیں گوتم نے منی سوہی کو پسند کر لیا تھا۔

سب کو یقین ہو گیا تھا کہ منی سوہی جا رہی ہے۔ لیکن نہیں یقین آرہا تھا تو دادی رکمن کو۔ "میں تو اس دن مانوں گی جس دن سچی یہ ڈپٹی بھون کی دہلیز چھوڑے گی اور ڈولی میں بیٹھتے ہوئے پوری ایک پاتیلی چاولوں کی اپنے سر کے اوپر سے پھینکے گی۔" اور پھر جیسے شادی میں ہونے اور نہ ہونے والی باتیں دادی رکمن اپنے سامنے دیکھ رہی تھی:

"دیکھ بہو گوتم کا باپ ڈولی پر سے کھوٹے پیسے بھی پھینکے

تو انہیں پھر یہی سمجھنا۔" پھر اس بات کا ڈر کہ جس بات سے ڈرو آخر وہی ہوتی ہے۔

دادی نے دیول میں مورتی کے لئے دستروں کی منت تو مانی ہی تھی جب ان شادی درگاہ پہ جا کر سرکی دیگ چڑھی، مان آئی، رما نند داس شاہد کی، ان کو بھی لے گئی تھی، جیسے رشوت کے طور طریقوں کی اچھی طرح سے سمجھ جاننے والا کسی بچولے، کسی واقف کار کو ساتھ لے لیتا ہے تاکہ قانون کہیں الٹا ہی نہ پڑے۔

اب بیاہ کے سلسلے میں چاروں طرف سے منی کو ہدایتیں ہونے لگیں: جو جانتی تھیں وہ بھی اور جو الھڑ تھیں وہ بھی اپنے اپنے طریقے سے مرد کو مطیع کرنے کے طریقے بتانے لگیں، اور پھر دادی جس کے مرد کو گئے ہوئے پچاس سال سے اوپر ہونے کو آئے تھے اور جس کے بچاروں میں مرد اس کی آنکھوں کی طرح دھندلا سا ہو کر رہ گیا تھا، بولی: "دیکھو بیٹا، میں تیرے نکٹ ہوں گی بھی اور نہیں بھی۔ ہاں جہاں سہاگن کھڑی ہو سکتی ہے وہاں بدھوا تو نہیں ہو سکتی۔ یہی ہے ساری دنیا کی ریت، یہی شاستر پران بھی کہتے ہیں، ٹھیک ہی کہتے ہیں۔" پھر وہ ایک ٹھنڈی سانس بھرتی، آنکھیں پونچھتی ہوئی جا رہی ہوتی، "اور سن،

جب پھیرے ہوں گے تو جھک کے چلنا، بہت جھک کے، برن نہیں کیا کرایا سب دھرا رہ جائے گا۔ دیکھ، یوں۔“ اور پھر دادی رشمن سر پر اپنے بیٹے جگن کی باندھی باندھائی پگڑی رکھ لیتی اور ہاتھ میں کہ ان کی جگہ کپڑے دھونے والی تھپکی اور دولہا بنی ہوئی اپنی طرف سے اکڑ اکڑ کر چلتی۔ عورتیں ہنستیں، لڑکیاں لوٹ پوٹ ہوتی ہوئی ایک دوسرے کے اوپر گرتیں، اترنے لگتیں، منی شرماتی، اور تب پر دادی اسے برابر پیچھے جھک کر آنے کے لئے کہتی۔

گلو کی ماں پکار اٹھتی: ”چھ پھیرے لینا ماں، ساتواں مت لینا“

گلو کی ماں کا مطلب تھا سات پھیرے ہوتے تو منی کی دادی کے ساتھ شادی ہو جائے گی، ایسی شادی جسے دیدہ شاستر تو کیا سوئم بھگوان بھی نہیں توڑ سکتے۔

جب منی پیچھے آتی ہوئی تھوڑا کم جھکتی دادی مڑ کر دھپ سے ایک ہاتھ اس کے سر پہ مارتی۔ ”پیچھی، اور پیچھی“ منی درد سے بلبلاتی ہوئی روتی بھی اور ہنستی بھی۔ ”وہ بھاڑ میں جائے ایسا دولہا“ وہ دادی کی طرف دیکھتے ہوئے کہتی، ”جب وقت آئے گا تو

دیکھا جائے گا۔،، دادی اسے پھٹکارتی :

"دولتیبوں چلی، عورت نہ جھکے تو اس دنیا کا چکر نہیں چلتا۔۔ توہیں سوگوار ہوئے۔ جو نیچا ہونا ہے۔ آخر وہی اونچا ہونا ہے اور پھر تو؟ تجھے تو اور بھی نیچی ہو کر چلنا چاہیئے جیسے سوئم بھگوان نے اونچی بنایا۔ مرد کا سواگت کرنا ہی پڑتا ہے۔ وہ جا چک ہونا ہے نا نہیں کوئی دان مانگتا ہے جو دنیا ہی اچینت ہے۔ کبھی دیوی بھی پجاری پر اپنے کواڑ بند کرتی ہے؟،،

یہ دادی کو بھی نہ معلوم تھا کہ دیکھنے میں یہ سرکش لڑکی وقت آنے پر جھک کے چلنا تو ایک طرف رینگنے، لیٹ جانے کو بھی تیار ہو گی۔

شام نگی میں ایکا ایکی بیسیوں ہی لڑکیاں پیدا ہو گئیں۔ وہ آج تھوڑی پیدا ہوتی تھیں ؟ تھیں وہ یہیں : برسوں، صدیوں سے : بس بیاہ کا شبد اچارن کرنے کی دیر تھی کہ وہ جیسے کسی جادو کسی جنتر کے زور سے بے اختیار، بے بس، ایک دوسری پر گرتی پڑتی ہوئی کہیں سے آگئیں، جیسے آموں کے موسم میں بڑی بڑی ہری نیلی مکھیاں کہیں سے اپنے آپ چلی آتی ہیں اور جب تک کوئی آم چوستا رہے وہ ارد گرد منڈلاتی، بھنبھناتی

رہتی ہیں۔ آتے ہی وہ کوئی ڈھولک ہاتھ میں لے لیتی ہیں اور ایسے ایسے نورانی گانے گاتی ہیں جو دادی کی آنکھوں کی طرح کی دھندلی صدیوں سے ان کے گلے میں اٹکے ہوتے ہیں۔ پھر ایک جیجا ہے، پیار کرنے کو ملتا ہے جیسے ہر عورت کو بدن سہلوانے، دبوانے سے ایک عجیب طرح کا رتھ، ایک خاص قسم کا خط آتا ہے۔ ایسے ہی ان لڑکیوں کو بھی جب کوئی جیجا، برات میں آیا ہوا کوئی منچلا ان کے چٹکی کاٹ لیتا ہے اور یا کمر میں اس جگہ کو چھو لیتا ہے جہاں بجلی کے سینکڑوں، ہزاروں کلو واٹ جمع ہوتے ہیں۔ باہر تو کوئی ڈر کے مارے ان کی طرف انگلی اٹھانے کی ہمت کرتا ہے اور نہ یہ اٹھانے دیتی ہیں لیکن شادی بیاہ میں ان باتوں کی کھلی چھٹی ہوتی ہے۔ بڑے، چھوٹے ——— سب دیکھتے ہیں اور مسکرا کر چپ ہو جاتے ہیں۔ جیجے کو بھی تو سالیاں ملتی ہیں۔ ایک ایک سالی، آدھی گھر والی۔ اتنی لڑکیوں کا جھرمٹ چھیڑنے، پیار کرنے کو پھر زندگی میں کہاں ملتا ہے؟ اور یہ سالیاں اپنے روپ کی کوئی جھلک دکھا کر قدم قدم پر کوئی انگیخت پیدا کرتی ہوئی کہیں چھپیں، کہیں الوپ ہو جاتی ہیں جیسے بوگنبشوروں اور رنیشیوں کے من کی مینکائیں، اللہ والوں کی حوریں جو انہی کے داخلی تخیل کی پیداوار ہوتی ہیں جس کے کارن ان آسمانی عورتوں

کے بدن پر ایک بھی تو خط غلط نہیں لگا ہوتا۔ اگر یوگی پتلی عورت کو پسند کرتا ہے تو وہ پتلی ہوتی ہیں، بھری پری کا گرویدہ ہے تو وہ بھری پری، اور یوگیشور انہی کے ساتھ آلنگن، انہی کے ساتھ پریم کمبلن کے لئے مچل جاتا ہے اور آگے بڑھنے، اوپر جانے سے انکار کر دیتا ہے۔ یوگیشور کو پکارتے پکارتے شیر روپی گورو کا گلا بیٹھ جاتا ہے اور جیوتی سروپ ایشور کی آنکھوں سے جوت جاتی رہتی ہے —— اور یہ اپسرائیں، یہ حوریں یوگیوں اور صوفیوں کو اپنے رتبے، مقام سے گرا کر اس خلوت صحیح سے ہمیشہ کے لئے غلط ہو جاتی ہیں۔

مگر یہ دنیا کتنی پیاری جگہ ہے۔ جہاں کے لوگ خدا نے بنائے اور پھر فرشتوں سے کہا: "ان کو سجدہ کرو۔" سالیوں کے چلے جانے کے بعد آخر ایک دن، ایک رات عظیم "وہ" سامنے بیٹھی ہوتی ہے —— ویدوں کے منتر اور شاستروں کے اننت جس کی طرف کبھی واضح اور کبھی مبہم سے اشارے کرتے ہیں، بیاہ شادی کے گیت جس کے لئے مرتعش اور بھٹوں میں جس کے لئے اینٹیں پکتی ہیں، مل میں کام کرنے والا مزدور جس کے لئے پان بیڑی کی دکان پر پہنچ کر اپنی جیب کی آخری دونی سے آنکڑا اٹھاتا ہے اور

سبھاؤں میں شور جس کے لئے بڑھتا ہی جاتا ہے، جسے اس کے بچوں کی ماں ہونا ہے اس لئے وہ اس دھرتی کی طرح ڈرتی سمٹتی ہے جس میں کسان آتا ہے: ہل کاندھے پر ڈالے ہوئے، جس کا کا تیز اور تیکھا پھل ابھی ابھی کسی لوہار نے تیز آنچ والی بھٹی میں ڈھالا ہے۔ سر پر پگڑی باندھے، کلغی سجائے وہ راجہ جنک معلوم ہونے لگتا ہے جو دھرتی کو الٹائے گا تو نہ جانے کب سے اس میں دبی ہوئی کوئی ٹھکی پھوٹ جائے گی اور اس میں سے بڑے ہی صبر بڑے ہی انتظار، بڑے ہی پیار والی جنک دلاری سیتا پیدا ہو گی جس کے لئے اس کا عظیم "وہ" آتا ہے: ایک ہاتھ میں مقدس کتاب دوسرے میں شراب لیئے: تاریخ کے دھندلے ادوار میں وہ ان گنت گوپیوں سے کھیلا ہے، ان کے ساتھ بے شمار راسیں رچائی ہیں۔ اور اب اس کی آنکھوں میں ڈر ہے اور محبت اور ہیبت وہ سمجھتا ہے اس بار کسی نرو نازہ، حسین وجمیل دوشیزہ کے بدن پر قبضہ جمائے گا، بار بار اپنائے گا، بے ہوش ہو ہو جائے گا۔! اور نہیں جانتا وہ محض ایک تنکا ہے زندگی کے بحر زخار میں، صرف ایک بہانا ہے تخلیق کے اس لامتناہی عمل کو ایک بار چھیڑ دینے ایک بار حرکت میں لے آنے کا اور پھر بھول جانے کا، دبنا بھر کے

گوداموں میں بھرا ہوا اناج کسی وقت ایک دانہ محض تھا جو شاید اب اس دانے کو بھی معلوم نہیں کیونکہ موت اسے لوٹ چکی ہے ۔ زندگی ایک بار اس کے ہاتھوں سے چھوٹ چکی ہے۔ کاش انسان کو یہ معلوم ہو جائے تو وہ ایک بھوکے کی طرح عورت کی طرف ہاتھ نہ بڑھائے یا پھر عورت بھی خواہ مخواہ اپنی عصمت نہ بچاتے، اس پر سونے چاندی کے ورق نہ لگاتے۔

شادی کو کچھ ہی دن رہ گئے تو پتا چلا گوتم نے سائیکلوں کی ایجنسی چھوڑ دی ہے اور آسام میں ڈیما پور سے پچاس ساٹھ میل دور کسی جنگل میں کوئی ٹھیکہ لے لیا ہے جہاں مہینے ایک کے بعد کہیں چٹھی پہنچتی تھی، جیسے ہوائی ڈاک ریل گاڑی سے نہیں پیدل چل کر جاتی ہو۔ شادی ایک غیر معین عرصے کے لئے ملتوی ہو گئی!

دادی کی تو جان ہی نکل گئی، اسے پسینے آنے لگے۔ ٹھنڈے پسینے ـــــ جن کا باہر کی سردی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس سے پہلے جب بھی گوتم کی چٹھی آئی دادی رقمن نے منی سوہی کو بلایا اور اس کا سر چوم چوم لیا۔ بلایا اب کے بھی، لیکن چومنے کی بجائے زور کا ایک دو ہتڑ اس کے سر پہ جڑ دیا۔ یہ لڑکی ہی منحوس تھی، کسی منحوس

گھڑی میں پیدا ہوئی، کسی منحوس ماں باپ کے گھر جنم لیا اور اب جہاں بھی جائے گی تباہی لائے گی۔ دنیا پورا اور ڈیما پور تو کیا پورے بہار، پورے بنگال، آسام دلیس میں تباہی اور بربادی لائے گی۔
پھر گیتا کے پنے کھلے، پھر سترہویں ادھیائے کا پاٹھ ہوا، پھر دادی مری، پھر جی اٹھی کیونکہ پاٹھ کی سماپتی کے ساتھ ہی گوتم کی چٹھی چلی آئی تھی جس میں لکھا تھا اگلے سال مئی کی بیس تاریخ کا ساتا نکلا ہے۔ دادی سمجھ بیٹھی تھی گوتم نے کہیں منی کو چلتے ہوئے دیکھ لیا ہے اور سوچ لیا ہے۔ لیکن اسے کیا معلوم منی، بیٹھی ہوئی منی، کی کثافت نے گوتم کے پورے ذہن کا کچھ یوں احاطہ کر رکھا تھا کہ وہاں اب کسی اور لطیف سی سوچ اور سمجھ کی گنجائش ہی نہ تھی۔ الٹوا تو ایک مجبوری تھا۔
دادی ایک بار پھر جینے اور دن گننے لگی: جیسے بیوہ چھت کی کڑیاں اور رنڈوا آسمان کے تارے گنتا ہے، اور ایکا ایکی انسان تو کیا وہ بھگوان، آگ، پانی، ہوا —— سب کو گالیاں دینے لگی۔ اس میں صبر تو حد درجے کا تھا لیکن شکر نام کو نہیں۔ جب تک منی پانچ فٹ سوا دس انچ کی ہو چکی تھی۔ اس کی کہانی اس قصے کی طرح ہو گئی تھی جس میں قصہ کہنے والا اپنا سر بچانے کے

لئے بادشاہ کو ایسی کہانی سنانا ہے۔ جو ختم نہیں ہو سکتی: سوراخ میں سے چڑیا آئی اور دانہ لے گئی۔ چڑیا پھر آئی اور ایک دانہ اور لے گئی ۔۔۔ اور کوٹھڑی دانوں سے بھری پڑی تھی، آسمان ستاروں سے پٹا ہوا تھا۔ شاہد میاں کے گھر کے پاس کچنار میں ہزاروں لاکھوں کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ بیاہ اور صرف بیاہ ہی اس طوفانی عمل کو روک سکتا ہے ورنہ کوئی ہی دن میں منی کا سر آکاش میں ہوگا اور وہ اوپر کی اوپر چلی جائے گی، جیسے کنس کے نیچے زینے سے مہامایا بجلی بن کر آسمان کی طرف لپک گئی تھی۔

"جب تک تو گو تو بھی لمبا ہو چکا ہوگا۔" دادی کہتی۔

"کیا پتا: میا؟" جمنا کہتی۔ پھر ڈگا مبروں کی بہو تنہ میک باتی ایک قدم آگے بڑھ کر بول اٹھتی، "ہو سکتا ہے۔ انچ دو انچ چھوٹا بھی ہو گیا ہو۔" اور پھر وہ ایک دوسرے کو ٹہوکے دیتے ہوئے مسکرانے لگتیں۔

"ارے!" دادی تنہ میک بائی کو پھٹکارتی، "میں اتنا بھی نہیں سمجھتی؟ نپونی! ایک بار جو بڑھ جاتے پھر نہیں گھٹتا۔" اور پھر "میں بوڑھی جو ہو گئی ہوں، تنہ میکا! پر عقل میں تجھ پہ بیس

ہوں بس،،

پھر گلو کی ماں حساب کر کے بتاتی۔" اگر لڑکے کا قد اتنا ہی رہے دادی! اور لڑکی کا چار پانچ گرہ، دو تین انگل بڑھ جاتے تو وہ آپی چھوٹا ہو گیا کہ نہیں ہو گیا؟،،

اتنا حساب دادی کو کہاں آتا تھا۔ منی سوہی کے دو تین انگل اور لمبی ہو جانے کے خیال ہی سے خون اس کے خشک چہرے کی رگوں اور ریشوں میں دوڑنے لگتا، یوں معلوم ہوتا جیسے پیپل سے گرا ہوا پتا پھر اپنے ڈال پہ جا لگا ہے اور دوسرے پتوں سے ٹکرا رہا ہے، شور مچا رہا ہے۔ وہ تڑ مبکا کہ یا گلو کی ماں کو گالیاں دینے لگتی: "چھوٹا ہو تیرا باپ، چھوٹا ہو تیرا بھائی، چھوٹا ہو تیرا خصم،،،

اور عورتیں یہ سمجھتی ہوئی کہ بوڑھی دادی کی گالیوں سے گرہ ٹلے ہنستی کھیلتی بڑے گھر چلی جاتیں، جہاں انہیں اپنے مرد، کیا باپ اور کیا بھائی اور کیا شوہر، ایکا ایکی چھوٹے معلوم ہونے لگتے۔

منی سوہی اب تک اپنی ہر نس، اپنے ہر لوپر سے نفرت کرنے لگی تھی۔ وہ شادی بیاہ کے نام ہی سے خائف ہونے لگی۔ کیا شادی بیاہ ہی رہ گیا ہے اس دنیا میں؟ اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں کہیں بھی جانا ہو وہاں پہنچنے کے لئے بیسیوں سڑکیں، سینکڑوں پگڈنڈیاں

ہوتی ہیں، بیاہ کے لئے کیا ایک ہی جرنیلی سڑک ہے؟ آخر تھک ہار کر منی بیٹھ جاتی، سو جاتی ـــــ جہاں اسے خواب میں دولہے ہی دولہے دکھائی دیتے۔

ایک دن دیویندر انگریزی تصویر "مولان روژ" دیکھ آیا جس میں اداکار، جوزے فیرار، اپنے پیر پیچھے باندھ کر فرانس کا بونا مصوّر لترک LUTREE بنتا ہے پہلے تو دیویندر نے نونو کروڑ لگا لیا اپنے دلیش بھارت کو دیں جس میں اتنا زور لگانے پر بھی صنعتی ترقی نہیں ہوتی، جہاں سائیکل کے کچھ پرزے ابھی تک ولایت سے آتے ہیں، جہاں میک اپ کا آرٹ اتنا بھی نہیں پنپ سکا جس سے لمبے قد کا ایک آدمی ٹھگنا اور بونا لگ سکے، اور اس بات کو وہ بھول ہی گیا کہ وہ پہلے ہی ٹھگنا ہے۔ اس سے اور ٹھگنا نہیں ہو سکتا۔

اس پر بھی دیویندر نے جوزے فیرار کی طرح اپنے پیر پیچھے کی طرف باندھے اور گھٹنوں کے بل چل چل کر منی کو دکھانے لگا:

"ایسے ہی پیر باندھ لینا، منی! تب گو تم کے ساتھ ٹھیک سے پھیرے لے سکے گی۔"

"اگر رسی کھل گئی تو۔" منی کی سہیلی گوراں پوچھتی۔

"تو چپ کرنا۔" دیویندرا سے ڈانٹ دینا، "منی کا تو پھر بھی بیاہ ہو جائے گا، ڈھائی فٹ! تیرا کبھی ہو گا ہی نہیں۔"

اور چھوٹے قد کی گوراں دیویندر کو دانت دکھاتے ہوئے "ای ای ای" کرتی اور پھر ایک طرف چھپ کر رونے لگتی اور پھر آپ ہی اپنے آپ کو منا کر منی کے پاس آجاتی اور کہتی:

"منا! کہیں ایسا نہیں ہو سکتا کہ تو اپنا کچھ قد مجھے دے دے اور میرا کچھ آپ لے لے۔"

"ایسا ہو جائے تو پھر دنیا ہی نہ بس جائے۔" منی جواب دیتی۔

اور پھر دونوں مل کر اس اُجڑی ہوئی دنیا کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگیں جہاں ابھی تک دیویندرا اپنی ہیکڑ میں گھٹنوں کے بل چل کر منی کو دکھا رہا تھا اور کہہ رہا تھا: "ایسے۔ ایسے۔ کسی کو پتا بھی نہ چلے گا۔" اپنے الٹے طریقے سے وہ اس لمبی لڑکی کو وہی بات سمجھا رہا تھا جو آج سے صدیوں پہلے ارسطو نے عورت کے نیچے گھوڑا بنتے ہوئے سکندر کو سمجھانے کی کوشش کی تھی لیکن پوری طرح سے سمجھا نہ پایا تھا۔ اس ادھورے کام کو دیویندر پورا کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ اسے اذیت ہو رہی تھی۔

لیکن کرب کا کوئی بھی اثر وہ اپنے چہرے پر نہ آنے دیتا۔ خاصی دیر تک وہ چلتا رہا، حتیٰ کہ اس کے گھٹنے چھل گئے۔ نرمیکا اور رچنا اس کی طرف دیکھ کر ایک دوسری کو کہنیاں مار رہی تھیں اور ہنس رہی تھیں اور ہنس رہی تھیں اور پکار رہی تھیں: "دو شیلا۔

اری او شیلا۔"

آخر ایک دن برات آ ہی گئی، پھیرے بھی ہو ہی گئے۔

پھیروں میں منی دوھری نہری ہو کر چل رہی تھی لیکن اب اس بات کا کیا علاج کہ اتنی نیچی ہونے ہوئے بھی وہ گوتم سے لمبی لگ رہی تھی۔ نرمیکا کا خیال صحیح تھا۔ گوتم کا قد اور بھی چھوٹا ہو گیا تھا اور یا منی کا بڑا۔ پل پل کے بعد پھیرے لیتی ہوئی منی کے کان میں کوئی کہہ دیتا:

"نیچی، اور نیچی۔" منی نے دھرتی میں گھس جانے کی کوشش کی لیکن دھرتی نے ساتھ نہ دیا۔ وہ آسمان کی طرف لپک سکتی تھی دھرتی میں نہ سما سکتی تھی۔

آشیرواد کی جگہ کئی بار دادی کے گپ چپ دھپے منی کے سر پر پڑے جس سے اس کا سر بول اٹھا۔ وہ تو اسے اپنی آخری مصیبت سمجھتی تھی لیکن دادی کا خیال ایسا نہ تھا۔ جو جھوٹ اس

نے اور اس کے بیٹے، پوتے اور نیلی محلے کے سب مرد عورتوں نے
مل کر بولا تھا آخر تو اسے کھلنا تھا۔ دادی چاہتی تھی۔ کھلے تو کھلے پر
ابھی نہ کھلے۔ ایک بار شادی ہو جائے پھر اسے انسان تو کیا بھگوان
بھی نہ توڑ سکیں گے۔ لیکن آخر وہ پھر منی کو اونچا ہو کر چلتی ہوتی،
دیکھتی تو اپنے کلیجے میں مکا مارتے ہوئے کہتی: "ہائے رانڈ، تو
نہ بسے گی۔"

پنڈت لوگ منتر پڑھتے رہے۔ جن کا مطلب تھا: تم جانوروں
کی طرح سے نہیں رہو گے۔ بے موسم کا بھوگ بلاس نہیں کرو گے۔
تم بیمار اور فاترالعقل بچے اس دنیا میں نہیں لاؤ گے۔ اور ارد
گرد کے لوگ بیمار اور فاترالعقل بچوں ہی کی طرح سے بیاہ کی
رسم کو دیکھ رہے تھے، شاید اس لئے کہ وہ شلوکوں کی زبان ——
سنسکرت —— سے واقف نہ تھے:

بیاہ ہو جانے کے بعد جب بھی گوتم اندر، ڈپٹی بھون کی بیٹھک
میں، آیا اس نے منی کو بیٹھے ہوئے پایا۔ منی کو اٹھنے بیٹھنے، چلنے
پھرنے کی سخت مناہی تھی جس سے اس کے بدن کی ہڈیاں تک
اکڑ گئیں۔ اتنی دیر بیٹھے رہنے سے اسے یوں محسوس ہونے لگا۔
جیسے وہ پیدا ہی نہیں ہوئی، ابھی تک۔ ماں کی کوکھ میں پڑی ہے

اور باہر آنے، ہاتھ پیر پھیلانے کے لئے تڑپ رہی ہے۔

سوکھم منی نے گوتم کو اپنا داماد اور منی کو اپنی بیٹی جانتے ہوئے اپنے گھر کھانے پر بلایا لیکن دیویندر نے اسے سمجھا بجھا کر لوٹا دیا۔ شام کے قریب گوتم نے سینما دیکھنے کا پروگرام بنا لیا۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ جانا، کوئی موج اڑانا چاہتا تھا لیکن دادی نے انکار کر دیا۔ وہ خود تو کچھ نہ بولی لیکن اپنے بیٹے جگن ناتھ کو اشارہ کر دیا۔ جس نے بڑے پیار کے ساتھ گوتم سے کہا: "یہاں نہیں بیٹا۔ ہم نیا گی ذرا پرانے خیال کے لوگ ہیں، تو اسے گھر لے جانا، پھر جو جی چاہے کرنا۔"

اور گوتم خاموش ہو گیا۔

اگلی سویرے کو گوتم کا باپ اور برات میں آئے ہوئے سب آدمی ڈیما پور جانے کے لئے روانہ ہونے والے تھے۔ پہلے کلکتے جانا تھا۔ اس میں بھی ریت تھی کیونکہ بھائی ہونے کے ناطے دیویندر ہی کو منی کو ڈولی میں ڈالنا تھا۔ کسی کتاب میں لکھا ہے کہ مرد کو شادی، اس وقت کرنی چاہیئے جب وہ عورت کو اپنے پٹھوں کے زور سے، ایک ہی ہاتھ سے اٹھا سکتا ہو۔ دیویندر شادی شدہ آدمی تھا لیکن اس سے کنواری بہن کو اٹھایا نہ گیا۔ منی یوں اس

سے لپٹی ہوئی ڈولی میں جا بیٹھی کہ اس کے اٹھائے ہونے کا گمان ہو، حالانکہ وہ بیچ بیچ میں چلتی جا رہی تھی۔ منی نے ایک ہی مٹھی چاولوں کی سر کے اوپر سے پھینکی لیکن دادی جو تھی اس نے پوری بوری خالی کر دی۔ پھر ڈولی اٹھی، سسر نے ڈولی کے اوپر سے نئے پیسوں کی چھوٹ کی۔ چونکہ وہ خود جا کر بینک سے دس روپے کے نئے نئے پیسے لایا تھا۔ اس لئے وہ ڈولی پر سے گرتے ہوئے سورج کی روشنی میں چمک رہے تھے اور سچ مچ کی چھوٹی چھوٹی مہریں معلوم ہو رہے تھے۔ گلی بازار کے بچے پیسے اٹھانے، ڈولی کی راہ روکنے لگے۔ دادی رو رہی تھی اور بچوں سے کہہ رہی تھی: "بچو شہدو، جانے دو۔ ارے ڈولی کو تو جانے دو۔" جیسے ڈولی اب بھی واپس آسکتی تھی۔

دادی کے اشارے پر دیویندر بچوں کو مار مار کر راستے سے ہٹانے لگا۔ ایک چھوٹ اور ہوئی اور لرزتے ہوئے پیسے سامنے زمین پر گر رہے۔ دیویندر کے من کا بچہ ابھر آیا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ بھی لپکے اور چمکتے دمکتے ہوئے پیسے اٹھائے اور ان پیسوں کو لگی ہوئی مٹی اور دھول سے پیار کر کے جیب میں ڈال لے، لیکن اندر ہی اندر وہ مسکرا دیا۔

شیلا حسبِ معمول جھوٹ موٹ کے آنسو بہا رہی تھی۔
اس کے آنسوؤں سے سچے تو گوراں، گلو کی ماں، جمنا اور نرمیکا کے آنسو تھے جو اپنے اپنے من میں چھوڑے ہوئے یا چھوڑے جانے والے بھائیوں اور باپوں کو دیکھ رہی تھیں، پھر بہنوں کو، بھابیوں کو، جیسے سسرال کے سب رشتے جھوٹے ہوں؛ کیا نندیں اور کیا ساسیں اور کیا سسرے۔ شادی کے وقت وہ سب کیسے لپک لپک کر ذہن میں آ رہے تھے!

شیلا کو اندر ایک بہت ہی تسکین، ایک بہت بڑی چھٹی کا احساس ہوا۔ جبھی اس کی نظر دادی پر پڑی۔ جو تھڑے پر کھڑی اپنی دھندلی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر ڈولی کو دور ہی دور نگاہوں سے دور، دل سے دور بھیجنے کی کوشش کر رہی تھی۔ دادی کو دیکھتے ہی اس کے ماتھے پر تیور آ گئے اور اس نے کہا: "یہ دوسری ڈولی نہ جانے کب اٹھے گی؟"

دیویندر نے دادی کی طرف دیکھا۔ نہ جانے اس کے من میں کیا آئی کہ وہ دوڑ کر اس سے لپٹ گیا اور بولا: "ماں!" اور پھر وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر بلک بلک کر رونے لگا۔ دادی نے چھاتی میں چھپا لیا۔ وہ کہنے ہی والی تھی کہ دیویندر

نے دادی کو اپنے بازوؤں میں اٹھا لیا اور کسی ڈولی کی طرح
لے کر چل نکلا۔

منی کیا گئی کہ شام گلی اور تیلی محلے کی رونق بھی ساتھ ہی لیتی گئی، ہر چھوٹا بڑا پوچھتا تھا: "منی کی کوئی چھٹی آئی ہے یا نہیں"۔ اور ہمیشہ جواب ملتا: "آئی تو نہیں پر آجائے گی۔ مہینے دو مہینے کے بعد تو وہاں چھٹی پہنچتی ہے۔"

لیکن دادی رحمن بھینر سے ڈری ہوئی تھی۔ وہاں ضرور ہی جھگڑے ہو گئے ہوں گے، ضرور انہوں نے میری منی کو گھر سے نکال دیا ہو گا اور وہ کہیں جنگلوں میں خاک چھانتی پھر رہی ہو گی۔ ان جنگلوں میں جہاں سانپ سانپ جتنی بڑی جونکیں ہوتی ہیں، پیروں سے چمٹ جاتی ہیں اور ہولے ہولے یوں خون چوستی ہیں کہ انسان کو پتا بھی نہیں چلتا۔ وہ یونہی جیسے تھک کر آرام کرنے کے لئے، بیٹھتا ہے تو پھر نہیں اٹھتا۔

ضرور منی کو کوئی شیر چیتا کھا گیا ہو گا، ورنہ مہینوں سے چھٹی نہ لکھنے کا کیا مطلب؟ اور پھر بیچ میں ایک آدھ چھٹی آ ہی جاتی جسے دادی پہلے دیوبند رسے پڑھواتی پھر شامد میاں اور پھر سو کھم ڈگامبر

سے۔ تب کہیں جا کے اس کی تسلّی ہوتی۔ تسلّی کہاں؟ اگر منی لمبا خط لکھتی تو دادی کو یوں معلوم ہوتا جیسے کوئی رونے رو رہی ہے الفاظ جن کا ساتھ نہیں دیتے۔ اگر چھوٹی لکھتی تو کہتی: "دیکھا نا! میں تو پہلے ہی کہتی تھی اسے کوئی منہ نہیں لگائے گا۔ کوئی ایسی بات ہے جو منی چھپا رہی ہے۔ ورنہ مجھے ایسے دو اکھر لکھ کے بھیج دیتی۔ یہی ہے نا اپنے دیش کی بیٹیوں کا، مرتی مر جاتی ہیں پر شکایت کا لفظ بھی منہ نہیں لاتیں۔ ہے رام اب کیا ہو گا؟ کہیں میں اُڑ کر ڈیما پور چلی جاؤں، ایک بار میں اپنی سو ہی کو ہنستے، بسنتے ہوئے دیکھ لوں۔ تم سب جھوٹ کہتے ہو، ضرور وہاں کوئی گڑ بڑ ہے۔ یہ میری بیٹی کو جس نے تنگ کیا بھگوان اس کا بھی بھلا نہیں کرے گا! میں مرنا چاہتی تھی، ہاں، اب اس دنیا میں رہ ہی کیا گیا ہے، لیکن یہ مجھے مرنے، آرام سے جانے بھی نہیں دیتی ہے۔ بھگوان! انسان دنیا میں جس کو سجن سمجھتا ہے وہ کتنا بڑا دشمن ہوتا ہے۔"

اور پھر "یہ ہو کیسے سکتا ہے۔ چھ فٹ کی لڑکی سے کوئی پانچ فٹ کا لڑکا بیاہ کرے اور پھر اسے بسا بھی لے۔ اب تک تو گوتو کو پتا بھی چل گیا ہو گا۔" اور دادی یوں بات کرتی جیسے شاید نہ بھی پتا چلا ہو! وہ اپنی آنکھیں بند کر لیتی اور من ہی من میں کئی پرانی باتیں

کرتی: "ہے بھگوان! کیا یہ نہیں ہو سکتا۔ جب گو تومنی کی طرف دیکھے تو وہ اسے چھوٹی لگے۔

ایک دن جگن ناتھ گھر میں آیا تو کچھ دیر کے لئے محلے تک شاستر ارتھ ہوتے رہے۔ گھر پہنچے پر شیلا سو رہی تھی۔ جگن ناتھ چپکے دبکے رسوئی میں گیا تاکہ بہو کو جگانا نہ پڑے۔ انہوں نے اوپر نیچے ہاتھ مارے، سر بھی چھینکے سے ٹکرا کر لہولہان کیا لیکن کہیں کھانا ہوتا تو ملتا۔ اس بات کا علم نہ دادی کو ہوا اور نہ دیوبندر کو، سب یہی سمجھتے رہے کہ شیلا نے حسب معمول کھانا پکایا ہو گا اور طاق میں رکھ دیا ہو گا۔

طاق میں پانی کا ایک گلاس پڑا تھا جو جگن ناتھ کا ہاتھ لگنے سے گرنے لگا لیکن جگن ناتھ نے سنبھال لیا اور وہ سمجھ گیا۔ اس نے گلاس اٹھایا اور ایک ہی سانس میں پینے کے بعد بولا "تیرا شکر ہے مالک!"

اور پھر وہ اندر جا کر لیٹ گیا۔ پانی اس کے کلیجے کو لگ گیا تھا اتفاق کی بات جگن ناتھ نے صبح سے کچھ نہ کھایا تھا۔ بھوکے پیٹ ہی وہ شاستر ارتھ کرتا رہا حالانکہ شاستروں ہی نے شریر کو ہری مندر قرار دے کر اس کی رکھشا مانس کا پرم دھرم لکھا ہے دراصل

جگن ناتھ نیا گی اداس ہو چکا تھا اور دنیا کی کوئی چیز اس کے چہرے پر مسکراہٹ نہ لا سکتی تھی۔ اپنی سمجھ میں وہ بھگوان کی پرستش کر رہا تھا لیکن بھگوان تو سمجھتے تھے کہ وہ انسان کی پوجا کر رہا ہے۔ اپنی مرحوم بیوی کی، جسے محبت اور صرف محبت کی وجہ سے وہ پیٹا کرتا تھا۔ لیکن اس پر بھی بھگوان نے جگن ناتھ کی حاضری لگا لی۔ بھگوان جانتے تھے کہ ان تک پہنچنے کے لئے جس بت کی پوجا کی جاتی ہے وہ خود کوئی حیثیت نہیں رکھتا، صرف مجھ تک پہنچنے کا ایک بہانہ ہے۔

پیٹ میں درد ہونے کے باوجود جگن ناتھ دھیان میں بیٹھ گئے۔ جبھی دادی کی آواز آئی۔ "بیٹا۔"

جگن ناتھ نے اندھیرے ہی میں منہ آواز کی طرف کر دیا، اور بولا: "ہاں ماں!"

"بیٹا، کھانا کھا لیا؟"

"ہاں ماں بہت کھا لیا، اب نیند نہیں آتی۔"

"کوئی چورن پھکی لاؤں؟ بہو کو جگاؤں؟"

"نہیں ماں، میں ایسے ہی سو جاؤں گا۔"

اور جگن ناتھ ایسے ہی سو گیا۔ وہ ایسی سمادھی میں گیا جس سے

پھر نہ اُٹھا۔

سویرے بہت شور مچا۔ شیلا تو جانتی تھی کہ اس نے جاتے سمے سسر جی کو کھانا بھی نہیں کھلایا۔ اس لئے وہ سب سے زیادہ اونچی آواز میں بین کر رہی تھی اور بار بار اپنے مرے ہوئے سسر کے پیروں پہ سر پٹخ رہی تھی۔ درحقیقت اس بات کا علم شیلا کو بھی نہ تھا کہ اس کے پتی دیو کے پتا اتنی سی بات پر اتنے خفا ہو جائیں گے، چھوٹی سی بھول کی اتنی بڑی سزا دیں گے۔ وہ ہرگز یہ نہیں چاہتی تھی کہ گھر میں آیا ہوا پنشن کا پیسہ بند ہو جائے۔ پتا نہیں بھگوان نے کس کی کرنی کی سزا کس کو دی۔ اس کی رمز یہ رہی، جانے۔ شیلا جسے اس دنیا سے بھیجنا چاہتی تھی وہ تو جی رہی تھی!

دادی کی وہی حالت ہوئی جو ماں کی ہو سکتی ہے۔ جب جگن ناتھ پتا جی کو لے جانے لگے، ارتھی اٹھائی گئی تو دادی یہ کہتے ہوئے بے ہوش ہو گئی:

"ارے تجھے شرم نہ آئی جگنا! میں بوڑھی تیرے کاندھے پر سوار ہو کر جاتی، تو جوان ہو کر میرے کندھوں پر سوار ہو کر جا رہا ہے۔"

گلی کا ایک آدمی، جو دیکھ رہا تھا، شاہد سے بولا:

"کیا فقرہ ہے۔ کوئی فلم میں لکھ دے تو لوگ رو رو کر پاگل

ہو جائیں۔"

شاہد نے ایک تیکھی نظر سے اس آدمی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:
"کیسے لکھ دیں بھائی، اس فقرے کو لکھنے کے لئے بیٹا دبنا پڑتا ہے"۔

شیلا تو سمجھتی ہو گی سسر تو گئے اب دادی نہ بچ سکے گی۔ دادی کئی دن سکتے میں رہی۔ دیویندر گھر سے نہ گیا۔ اسے دکھانے کے لئے تو شیلا کو بڑھیا کی دیکھ ریکھ کرنا ہی پڑتی تھی۔ پہلے تو شیلا نے پاٹھ کرنے کی پروا نہ کی لیکن جب اس نے دادی کا زندہ مردہ گلے پڑتے دیکھا تو پاٹھ بھی کیا لیکن دادی پھر وہیں کی وہیں تھی۔ شاید وہ اس منزل پر تھی جہاں گیتا کے پاٹھ بھی اثر نہیں کرتے۔

ہوش میں آتے ہی جو پہلا سوال دادی نے کیا، وہ تھا:
"منی کی چٹھی آئی ہے؟"

دیویندر نے دادی کے سر پر ہاتھ پھیرتے، پچکارتے ہوئے کہا: "نہیں دادی، آجائے گی، تو کیوں فکر کرتی ہے؟"

واقعی وہی ہوا۔ پتا کے مرنے کی خبر منی سوہی کو ایک ڈیڑھ مہینے کے بعد ملی جب کہ داہ سنسکار تو ایک طرف ہڈیاں بھی گنگا میں بہائی جا چکی تھیں، شاید اسی لئے اب بھاگ کر کالے کوسوں سے ڈیما پور آنا اور آسام کی جونکیں لانا بے کار کی بات تھی۔ اور جب

باپ کی موت کے مہینوں بعد تک بھی منی نہ آئی تو دادی نے ہنکارتے ہوئے کہا: "ارے منی ہو تو آئے" جیسے وہیں کسی نے منی کا گلا گھونٹ ڈالا۔ دادی کو دل کی اندرونی ترین گہرائیوں سے اس بات کا یقین تھا کہ منی اور گوتم کی انمل بے جوڑ شادی کبھی نبھ ہی نہیں سکتی۔ منی ابھی لوٹ کے آئی کہ آئی۔ روتی، چلاتی، سر پیٹتی ہوئی۔ برسات ہو کے ہٹی تھی۔ سورج کی گرمی کے راستے میں ایک بھی تو خاکی ذرہ حائل نہ ہوتا تھا۔ کرنیں زمین کھود کھود کر اس میں سے کھمبس نکال رہی تھیں۔ کچنار کا پیڑ تو سامنے مکان کے ساتے میں تھا اس لئے اس پہ گرمی کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ برسات کی پہلی ریزش، اور آخری ریزش بھی، پیڑ پہ لگے ہوئے پھولوں کا کچھ نہ بگاڑ سکی، اُلٹا اس نے کلیوں کے منہ بھی کھول دیئے اور اب پورا کچنار ہنستا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس کی ایک ڈالی سامنے کھتریوں کے مکان کی کھڑکی میں جا گھسی تھی جہاں لال شنیل کا سوٹ پہنے کھتریوں کی بہو کھڑی تھی جسے چند ہی دن پہلے وہ لکھنؤ سے بیاہ کر لائے تھے۔ لال لال کپڑے، مخملیں سوٹ پہنے ہوئے وہ بیر بہوٹی معلوم ہو رہی تھی جو برسات اور اس کے بعد تڑاکے میں سے کبھی اپنے آپ نکل آتی ہے۔

شاہد کی بہن، فردوس، منی کی شادی پر تو نہ آسکی تھی، اب تو منی کے بارے میں پوچھ پوچھ کر اس نے سب کا جینا حرام کر دیا — فردوس دادی رحمن کے پاس بیٹھی ہوئی اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہی تھی کہ گوراں بھاگی آئی۔

"دادی، دادی"، وہ بولی "منی آگئی!"

شیام گلی پوری کی پوری اُلٹ پڑی اور منی کو لینے کے لئے آگے بڑھی منی تانگے پر سے اُتری اور گوتم کے ساتھ ڈپٹی بھون کی طرف آنے لگی۔ اب وہ چھ فٹ کی تھی اور اس کے ساتھ اس کا پتی، گوتم جو سچ مچ تو مبکا اور گلو کی ماں کے کہنے کے مطابق پہلے سے بھی ٹھگنا اور بونا معلوم ہو رہا تھا — وہ دونوں آرہے تھے: ایک دوسرے کے وجود سے بے خبر، کسی بھی احساسِ ذات سے عاری۔ جبھی منی اپنے گھر کے پاس پہنچی تو دھپ سے ایک ہاتھ اس کے سر پہ پڑا تھا۔

"پنچی موتی، پنچی۔"

اور منی نے بلبلا کر دیکھا۔ دادی تھڑے پر کھڑی تھی اور اس کا عضو عضو کانپ رہا تھا۔ منی نے ایکا ایکی چلاتے ہوئے کہا "دادی ی ی ی۔" اور اس سے لپٹ گئی اور بھینچتے ہوئے بولی "بابو

کہاں بھیج دیتے دادی؟"

دادی نے مگن نانھو کے بارے میں کچھ نہ سنا، بولی:

"گوتم آیا ہے؟"

جبھی گوتم نے آکر دادی کے پیروں پر سر رکھ دیا۔

دادی رقمن نے منہ قریب کر کے آنکھیں سکوڑ کر دیکھا اور بولی: "جیتے رہو، جیتے رہو بیٹا، پرماتما۔۔۔۔" اور پھر اندر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگی، "آؤ، آؤ، میں واری، آؤ۔"

ماتم تو کچھ ہی دیر میں ختم ہو گیا۔ دراصل ماتم بھی اُوراس ہو گیا تھا اور اب ڈپٹی بھون میں قہقہے لگ رہے تھے، صرف شیلا تھی جسے سسر کی موت کے بعد اتنی جلدی ہنسنا اچھا نہ لگتا تھا۔

دادی نے دیکھا: منی خوش، بہت خوش ہو رہی تھی۔ گوتم، اس کی ماں، اس کا باپ اسے ہاتھوں سے چھاؤں کرتے تھے۔ ہاں، چھاؤں کرنے کے لئے انھیں سیڑھی ضرور لگانا پڑتی تھی دادی کو یہ بھی پتا چلا منو کو ساتواں مہینہ ہے!

گوتم جتنے دن بھی رہا بہت خوش، بہت ہنستا رہا۔ وہ دادی کے ساتھ مذاق کرتا رہا اور دادی اس کے ساتھ، نہ لمبے ہونے

کی بات سامنے آئی نہ چھوٹے ہونے کی۔ اور پھر وہ منی کو زچگی کے لئے
مائیکے چھوڑ کر دادی ماں کے پیر چھوتا ہوا چلا گیا۔

دادی کی بیماری لوٹ آئی۔ اب وہ خوشی کے مارے مر رہی
تھی، ایک تسکین، ایک تکمیل کے احساس کے ساتھ جا رہی تھی۔
ایک دن رات کے دو بجے کھانسی جو آئی تو کتنی دیر تک دم ہی
واپس نہ آیا۔ شیلا اور منی پھر دوڑیں۔ شیلا تو اب ان سب باتوں
کو بے کار سمجھتی تھی لیکن منی سوہی کا بھگوان پر پورا وشواس تھا
اس نے گوراں کی مدد سے دادی کو نیچے فرش پر اُتارا اور اس
کے کان کے پاس منہ کر کے بڑی شردھا کے ساتھ صرف گیتا
کا سترھواں ادھیائے بلکہ مہاتم بھی پڑھا اور اس کا پورا پھل
دادی کے نمت دیا ـــــ لیکن دادی ابھی تک جی رہی تھی! اس
کے چہرے پر ایک عجیب قسم کی نورانی مسکراہٹ کھیل رہی تھی ما
پھر بچوں کی سی شرارت چلی آئی۔

اس نے مرگھلے سے انداز میں دائیں اور دیکھا جس طرف
منی بیٹھی تھی جو گیتا کو تپائی پر رکھتے ہوئے بڑے غور سے دادی کی
سبک سی پروانہ دیکھ رہی تھی۔

"منی..." دادی نے نحیف سی آواز میں کہا۔

"ہاں دادی ماں،" منی بولی اور دادی کے منہ کے پاس کان کر دیا۔ دادی نے کچھ کہا۔ منی ایک دم شرما گئی اور پیچھے ہٹ گئی۔ شیلا پاس کھڑی تھی، بائیں طرف گوراں۔

"کیا پوچھا دادی نے؟" گوراں بولی۔

"کچھ نہیں۔" منی نے کہا اور پھر اور بھی شرما گئی، رنگ لال ہو گیا۔

گوراں نے ضد پکڑ لی تو منی بولی، "کہہ رہی تھی، ہائے ری منو وہ تجھ سے پیار کیسے کرتا ہو گا؟"

اور پھر سب نے مڑ کر دیکھا: دادی ٹھیک جیسے پہلے مسکرا رہی تھی ویسے ہی اب بھی مسکرا رہی ہے۔

اس کے بعد دانا ورن میں ہوا کا تنتو پریل ہو گیا اور بپائی پر پڑی ہوئی گیتا کے پنے اڑنے لگے اور اڑتے اڑتے وہاں آ کر رک گئے جہاں شبد سماپت لکھا ہوتا ہے!

دیوالہ

روپ متی، میری نند، جوان ہو چکی تھی۔ اس کی جوانی کا ثبوت شہر یہی نہ تھا اس کے لچھن بھی تھے، وہ اس کا چونک کے بات کرنا، بے وجہ ہنسنا، بے سبب کی دلگیری: بدگمانی اور پھر سب سے بڑی بات ـــ خواہ مخواہ کی رازداری!

مجھے یہ دنیا کبھی اچنبھے کی بات نہ معلوم ہوئی اور نہ ہی اس میں کوئی بہت بڑا بھید دکھائی دیا۔ ہاں! بارہ ساڑھے بارہ کی تھی جب باپو نے کانونیٹ سے مجھے اٹھا لیا اور شادی کر دی۔ ادھر شادی ہوئی ادھر میں مندروں کی اس بستی، دیول نگر، میں چلی آئی یہ نیچے چونے گچ میں جو گول گول شیشے ٹنکے ہیں اور ساج کی لکڑی کا بڑا پھاٹک ہے، سب جبھی بنا دیا تھا، ہاں، لوہے کے یہ موٹے موٹے کیل بعد میں گاڑھے تھے اور دروازے پر گنیش جی کی مورتی یہ بھی بعد ہی میں بنی تھی۔

میں یہیں ہوا محل کے اس بجارچے میں بیٹھی تھی۔ ہونٹوں کا لاکھا لکھوٹا مجھے خود بڑا لگ رہا تھا۔ مگر سسر جیٹھ وغیرہ سبھی پیڑھی پہ گئے ہوئے تھے۔ ددا بھی مندر سے نہیں لوٹی تھیں۔ یہ بھی سنتھر میں نہ تھے۔ اتنا ہی پتا تھا۔ دلیں بھر کی انڈی فابو میں کرنے گئے ہیں، ایک بار فابو آگئی تو اپنا گھر سونے کی اینٹوں سے بھر جاتے گا اگرچہ بہت سوں کے دیوالے نکل جائیں گے۔

کھانا پینا گھر، یہاں سبھی فیشن کے طور پہ کام کرتے تھے۔ کھائی پکائی کے علاوہ اور کیا تھا؟ صبح ہوتی تو ہم سوچتیں، کیا پکے گا؟ دوپہر تھوڑے کپڑے اِدھر اُدھر پھینکنے کے بعد شام کیا پکے گا؟ کوئی پوچھے گھوم پھر کے ادھر ادھر آٹڈ ہی پہ پہنچا ہے تو وا وبلا کیسا؟ وہی روز کی باتیں، روز کے چہرے، ساس میری دیکھنے میں بری نہیں لیکن کبھی بھنگن ہی اس سے اچھی لگنے لگتی، اس لئے جب گھر بھر سے جی اوب جاتا تو میں یہاں آ بیٹھتی۔ تم نے دیکھا ہے نا بالو کی ماں بہ بجار جا نیچے سے یوں ہی سا لگتا ہے، مگر ہے رامائن کا پشپک بِوان ایک آٹھ کلیا کمل، لال سیمنٹ کا جیسے نظارے کھڑا ہے۔ گھر کی طرف پیٹھ کر کے دیکھو تو نیچے بازار میں سب آر جار دکھائی پڑتی ہے۔ بھنگی، چمار، کھاد کے نئے کارخانے میں کام کرنے والے مجوریوں

گریب پر بدن میں محنت کا سرور، چہرے پر صحت کا نور، سینہ تانے ہوئے یوں معلوم ہوتے ہیں جیسے چٹان سے چٹان پھوڑنے جا رہے ہوں، اس بات کی بھی پروا نہیں مجوری ملے گی یا نہیں ملے گی، بھرا کیے والے، جن کی چھاتی کے نتھنوں میں گالیاں ہی اُبلتی رہتی ہیں۔ دوسروں کو تو کم ہی دیتے ہیں۔ اپنے جانور کو زیادہ، اپنے آپ کو سب سے زیادہ اور اس پر بڑے خوش، مارا ماری کرتے جا رہے ہیں تیز تیز، جیسے سویرا پورب سے کرنیں پھینکتے اُمڈتا ہے۔ ادھر چھانٹا، ادھر چابک، یوں لوگ اِدھر اُدھر بھاگتے ہیں۔ جیسے رات کا اندھیرا دن ہوتے ہی کوٹھڑیوں، میلے کچیلے کپڑوں اور نالیوں میں جا چھپتا ہے، منیم، دلال سیٹھ دھوتی کا پلو سمیٹتے ہوئے ایک طرف ہو جاتے ہیں۔ مگر جو بیچ سڑک کے جا رہی ہیں تو اپنی لاتیں، ہر وقت بیٹھے رہنے سے جن کے پیٹ میں ہوا پیچھے مالش کے لوٹے چلے آتے ہیں۔ جیسے کسی نے بڑے تکیے باندھ دیتے ہوں، چلتی ہیں تو پیچھے سے "بدھ دیو، بدھ دیو" کا جاپ ہوتا ہے۔ برات کبیر کی ہاتھ میں پانڈے جی ساتھ میں۔ دنیا جہاں سے بے خبر، برائے نام گھونگھٹ کاڑھے پتا نہیں کس مندر کو جا رہی ہیں۔ بڑے سے بڑا لوہے کا ڈنڈا بھی ان راستے کے پتھروں کو نہیں ہٹا سکتا۔ پھر اپنی جات

برادری کے سیٹھ، جات باہر کے بیوپاری جن کی ہڈیوں تک میں
پانی پڑ گیا ہے۔ بیچ والوں کے ہتھیلیاں جن کی طنابیں تک کمر میں
بندھی دکھ رہی ہیں۔ بس یہ بھی چھوکریوں کو گھور رہے ہیں گھونٹے
مشٹنڈے بھی ہیں۔ لیکن ایک کی نگاہ میں پل پڑنے والا پیار اور آشنا
دوسرے کی نظروں میں گھن اور نراشا۔ چھوکریاں بھی تو ان سے
نہیں شرمائیں۔ شرمائیں کن سے؟

ایسی باتیں دیکھ کے جی اور بھی گھبرا جاتا ہے۔ پھر سامنے دیکھ
لیتی ہوں، پورا مارواڑ نظر آتا ہے۔ پتھر ہی پتھر، بالو ہی بالو۔
سورج کی روشنی آڑی پڑتی ہے تو بالو کی کنی کنی دمک اُٹھتی ہے
معلوم ہوتا ہے ان گنت مہریں پڑی ہیں۔ اُٹھالو اور اندر باہر سب
بھر لو۔ دیس بھر کا سونا روپا اسی دھرتی میں چلا آیا ہے۔ بس یہی جھوٹی
چمک دمک ہے۔ ہریالی کہیں بھی نہیں۔ کہیں کوئی جھاڑی یا گسل
دوب دکھائی دے جاتی ہے۔ لیکن درخت نام کو نہیں۔ دور رونڈھیا
کے آنگن میں کوئی ٹینسا کا پیڑ کھڑا ہے یا چمبل کے کنارے ببجاسل
سر ہلا رہا ہے۔ وہ بھی نیچے سے ٹنڈ منڈ، اوپر ایک گپھا سا ہے۔
وہی دل کی دھڑکن تیز کر رہا ہے۔ میں تو کہتی ہوں کوئی ہمارا سب
سونا لے لے اور ہریالی دے دے۔

ماں مِتی، میری ساس، مجھے ہمیشہ یہاں بیٹھنے سے منع کرتی ہے۔
لیکن جب بھی میں یہیں بیٹھتی ہوں، ضد کے ساتھ، ٹھینگے کی طرح۔
اس کا کہنا ہے، "کھڑکی میں بیٹھنا کام نہیں بہو بیٹی کا۔ کھڑکی میں بیٹھتی ہے تو گنگا۔" میں کہتی ہوں۔ یہی حساب ہے تو ہماری طرح کی سبھی گھریلو عورتیں گنگا دیشیا ہیں۔ ہمیں کھڑکی جھروکا بھی نہ ملے تو اس سے مر جائیں۔ ہے نا بالو کی ماں؟ کھڑکی کے لئے عورت ہو نہ ہو، عورت کے لئے کھڑکی بڑی ضروری ہے۔

لیکن اس دن ہمیں کون ٹوک سکتا تھا؟ گوکل اشٹمی کا دن تھا گوپیوں کے کانہہ آج کے دن پیدا ہوئے تھے۔ رادھا بازار میں کوئی ہماہمی تھی؟ رام رام! ساری لوکائی اُمنگ کی طرح باہر چلی آئی تھی اور ترنگ کی طرح ناچتی، گاتی، بل کھاتی جا رہی تھی — سانول داس کے مندر کی طرف۔ اس میں عورتیں بہت تھیں، جیسے ان کے بنا سب ادھورا ہے۔ دھکے پڑتے تو برابر امنہ بنائیں اُوپر سے گالیاں دیتیں، بھیتر سے خوش۔ ایسا نہ ہوتا تو باہر ہی کیوں نکلتیں؟ یہ عجیب بات ہے، ہم عورتیں جس بات کو پسند نہیں کرتیں۔ آخر میں وہی کرتی ہیں۔ ہو سکتا ہے۔ میں غلط کہہ رہی ہوں، مگر ہمارے من کا لیپارہ انوکھا ضرور ہے۔ مردوں کو اس

بات کا کیا پتا؟ وہ تو سارا پڑھ لکھ کے بھی جانگلو ہی رہتے ہیں بس سیدھے۔ فلاں کام کرو، نہیں مار دیں گے یا۔ خبردار جو ساڑی کے ساتھ منڈوے کو گئیں، وہ اچھی عورت نہیں، ہوٹلوں میں جاتی ہے۔ کوئی پوچھے۔ نہیں کیسے پتا ہے جی؟ بیچارے ہمیں جانے کیا سمجھتے ہیں؟ نہیں جانتے جتنی دیر میں ان کے دل میں ایک خیال آتا ہے، ہمارے من سے بیسیوں ہو کے نکل جاتے ہیں۔ ہاں تو اس دن سب عورتیں کھڑکیوں میں چلی آئیں۔ جرٹت مڑت، انگ بانکڑی اور گہنوں کی نمائش تھی۔ سب عجیب سی نظروں سے نیچے بازار میں دیکھ رہی تھیں۔ پلو سر سے ہٹے ہوئے، چوٹیاں نیچے لٹکی ہوئیں یوں معلوم ہوتا تھا جیسے سیڑھیاں ہیں جو گھر کے بھیدی نے لٹکا رکھی ہیں تاکہ باہر کا چور ان کے سہارے چلا آئے اور آنکھوں کی کھڑکی سے اندر کود پڑے۔ پھر کیا ہے؟ سامنے تجوری پڑی ہے، تالی گھر والوں کے پاس، ہمت ہے تو توڑ لے۔

کہاں تو میں اکیلی بنی بیٹھی تھی کہاں روپ متی، ساس، ددا۔ سبھی آگئیں۔ جبھی پتا چلا ددا تو کب سے آئی بیٹھی تھی، کہیں اندر کے مندر میں گھنٹی بجا رہی تھی۔ ددا اور ساس دونو باہر دیکھ رہی تھیں، چہرے پر کوئی اثر نہیں، منہ بیرنگ لفافوں کی طرح

پیسے دد اور چھڑا لو، نہیں بھیجنے والے کو واپس۔ ہاں، ردپو کا منہ کھلا تھا۔ میں نے کہا۔

"ردپو! تو ادھر آجا اچھی —— میرے پاس۔"

بولی: "نہیں بھابی، میں ٹھیک ہوں۔"

پیچھے سے ددا بولی: "ارے! پیار سے بلاتی ہے بھابی، جاتی کیوں نہیں؟" ردپو نے شک بھری نظروں سے میری طرف دیکھا گویا مجھے اس کی کوئی بات پتا چل جائے گی۔ میں نے یوں دیکھا جیسے نہیں چلے گی اور وہ اُٹھ کر میرے پاس آگئی۔ میں نے جو اپنی بانہہ اس کے گرد ڈالی تو پتا چلا اس کے کولہے کتنے بڑے ہو گئے ہیں۔ ایک سال پہلے ہی ردپو کچھ بھی نہ تھی، اب سبھی کچھ ہے۔ ابھی میں نے اس سے پیار کی ایک بات بھی نہ کی تھی کہ ساس کی آواز آئی:-

"بہو! سر ڈھک اپنا، کیسے بیٹھی ہے؟"

میں نے اسی دم اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور سر ڈھکنے لگی۔ میں تمہیں سچ کہتی ہوں بالو کی ماں، مجھے پتا نہ تھا۔ میرے سر پر کپڑا نہیں، ننگی ہی بیٹھی ہوں ان عورتوں کی طرح جو سامنے بازار چے میں کھڑی تھیں اور تن من سبھی کو ہوا لگوا رہی تھیں۔ میں پھر دونوں ہاتھ

رکھ، یہاں کھڑکی میں ٹکا، ان پر ٹھوڑی رکھ نیچے دیکھنے لگی۔
نیچے اب عورتیں تو کہیں کہیں تھیں مرد بھی تھے۔ چھوٹے اور
کوئی لمبا کوئی ناٹا، کوئی چھوٹا کوئی موٹا، کسی نے داڑھی بڑھا
رکھی ہے تو کوئی صفاچٹ، کسی نے سر کے بالوں کے پلیٹ
بنا کندھے پر پھینک رکھے ہیں۔ کوئی پان کھا رہا ہے، کوئی بیڑی
کی راکھ چٹکی سے گراتا ہے کوئی لڑتا ہے، کوئی گالی دیتا ہے کوئی
کھاتا ہے لیکن اوپر کو سب دیکھ لیتے ہیں، بجلی کے تاروں کی
طرف اس سال کچھ زیادہ ہی مرد تھے۔ ایک دم یہ اتنے کہاں سے
چلے آئے؟ پھر میں نے سوچا: آخر ماؤں ہی نے پیدا کیے، آسمان سے
تو نہیں ٹپک پڑے۔ بیچ میں ایک ٹھٹ سا بندھا تھا اور باقی
کے سب اس کے گرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ ان کے سروں پہ
کوئی سات گز کی اونچائی پہ ایک رسی لٹک رہی تھی، جس کا
ایک سرا رنگڑوں کے گھر اور دوسرا چھنڈواڑے کے سیٹھ کے
ہاں سے بندھا تھا اور اس رسی کے سہارے بازار کے عین بیچ
مٹکی لٹک رہی تھی۔ یہ وہی مٹکی تھی جس میں ماتا جسودھا مکھن
رکھ دیا کرتی تھی اور اوپر ٹانگ دیتی تھی۔ وہ سمجھتی تھی، نٹ
کھٹ اس تک نہیں پہنچ پائے گا مگر وہ اپنے ساتھیوں کے

کندھوں پہ چڑھ کر پہنچ ہی جاتے تھے۔
تو اس گھیرے میں سے نکل کر کچھ آدمیوں نے دوسروں کے کندھوں پہ چڑھنا شروع کر دیا اور پھر ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈال، اندر کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو گئے۔ پھر دوسرا گھیرا آیا، تین آدمیوں کا اور پہلے چھ کے کندھوں پہ چڑھ کر کھڑا ہو گیا۔ آخر بھیڑ میں سے سانولے رنگ کا ایک جوان، لڑکا نکلا اور پھرتی سے باقی سب پہ یوں چڑھ گیا۔ جیسے وہ مرد نہیں سیڑھیاں ہیں۔ شکھر پہ پہنچ کے وہ کھڑا ہو گیا۔ اس کی قمیض میلی تھی اور اس پہ رنگ گرا ہوا تھا، بٹن کھلے تھے۔ میں تو تم سے سب بات کر سکتی ہوں۔ بالو کی ماں، جیسے تم مجھ سے کر لیتی ہو۔ میرا دل دھڑک اٹھا، اس لئے بھی کہ اس کے پیر ابھی نہیں جمے تھے، وہ گر بھی سکتا تھا۔ ایک دم اس کے پیر تھرائے اور وہ جھک گیا، اور پھر اسی دم تن کے کھڑا ہو گیا۔ اب اس کے پیر جم چکے تھے۔
لوگوں میں ایک شور سا مچ گیا۔ وہاں کھڑے ہوتے ہی اس لڑکے نے سیدھا اس طرف دیکھا جہاں میں بیٹھی تھی۔ ایک بجلی سی میرے بدن میں دوڑ گئی۔ پھر اس لڑکے نے دونوں ہاتھوں

کے پنجے ایک دوسرے میں گاڑ دیتے اور سر کے اوپر اُٹھا کر ہاتھ ہلاتے، کانپا، سنبھلا، مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے لہو میرے منہ کو آ رہا ہے۔ میری کنپٹیاں تک کانپنے لگیں۔ آخر اس نے ایک ہاتھ اوپر کر کے مٹکی تھام لی۔ لوگوں میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ وہ مٹکی تک پہنچ گیا تھا۔ اب اس نے دونوں ہاتھوں سے اسے تھام رکھا تھا۔ اس نے پھر اس طرف دیکھا جہاں میں بیٹھی تھی۔ رُوپو بیٹھی تھی، ساس اور ددا بیٹھی تھیں مجھے ایسا لگا جیسے وہ میری ہی طرف دیکھ کر مسکرا رہا ہے — جیسے وہ مجھے جانتا ہے، میں نے اسے کبھی دیکھا ہے لیکن جانے کتنی پرانی بات ہے، جس میں سمے نے تصویر دھونڈا لی ہے، لکیریں سی رہ گئی ہیں۔

میں نے چور نظروں سے رُوپو کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی تک منہ کھولے بیٹھی تھی، جیسے بچے تماشے میں کھول کر بیٹھتے ہیں مجھے یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے میرا بدن جل رہا تھا۔ اس میں سے سینک نکل رہی تھی اور آس پاس بیٹھی عورتوں کو لگ رہی تھی۔ مجھے یقین ہے مجھ سے بو اُٹھ رہی ہو گی، مگر کسی نے کچھ کہا نہیں۔

اب تک میری جیٹھانی بھی آ بیٹھی تھی۔ ایک میں ہی تھی جس کے ہاں لاکھ کرنے پر بھی کوئی بچہ نہ ہوا اور ایک وہ تھی — ہر سال جس کے پیٹ میں سے ایک کیڑا باہر چلا آتا تھا۔ اور میری جیٹھانی کو وہم کی بیماری ہو گئی تھی۔ ایک میں تھی جسے کوئی چیز گندی نہ دکھائی دیتی تھی اور ایک وہ جسے ہر چیز غلاظت سے پٹی مری معلوم دیتی، ہر وقت ہاتھ، منہ کپڑے دھوتی رہتی خاص طور پہ نل۔ اب بھی وہ نل کو راکھ سے مانجھ کر ہاتھ دھوتی ہوئی چلی آتی تھی۔ ہاتھ تولیے سے نہ پونچھے تھے۔ کیونکہ گھر میں ہر آتا جاتا اسی تولیے کو استعمال کرتا تھا۔ آکر اس نے گیلے ہاتھ بھی، جھٹکے تو پانی کے چھینٹے مجھ پہ پڑے۔ یوں لگا جیسے اُوڑ لگی دھرتی پہ برسات کی پہلی بوندیں پڑی ہوں اور بھک سے اُڑ گئی ہوں۔

میں نے مڑ کر دیکھا۔ روپو جا چکی تھی۔ شاید میرے پاس بیٹھ کر اسے سینک لگ رہی تھی یا پھر وہی اس کی ہیبت بھری باتیں کبھی پتا نہ چلا اگلے دم کیا کرے گی۔ اتفاق سے نظر نیچے گئی تو وہ ساج کے پھاٹک سے باہر کھڑی تھی اور اشٹمی کے جلوس کو دیکھ رہی تھی۔ جبھی وہ لڑکا لمبے لمبے ہاتھ ڈال کر مٹکی کے پانی کو باہر گرا رہا تھا۔ پھر وہ ہاتھ مار مار کر اسے توڑنے لگا۔

مگر وہ مٹکی جانے کس مٹی سے بنی تھی کہ ٹوٹتی ہی نہ تھی۔ آخر وہ اسے ٹکے مارنے لگا۔ جب اس پر نہ ٹوٹی تو اس نے مٹکی میں اپنا سر مارنا شروع کر دیا۔ جانے کیا ہوا، میری آنکھیں آپ سے آپ بند ہو گئیں۔ پھر تھوڑا کھلیں تو وہ ابھی تک سر مار رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں پھر آنکھیں لوٹ لیتی، مٹکی پھوٹ چکی تھی اور لوگ شور مچا رہے تھے۔

لڑکے نے چاروں طرف دیکھا۔ اس کے سر کو لگی ضرور تھی، مگر چہرے سے اس نے کوئی بات ظاہر نہ ہونے دی۔ اس نے جیب سے میلا کچیلا ایک رومال نکالا اور گردن پونچھ لی پھر وہ اپنے آپ جھک گیا اور ہولے ہولے نیچے اُترنے لگا۔ اس کے پیر کانپ رہے تھے۔ نیچے کے پرے پہ پہنچ کے وہ لڑکھڑا گیا وہ گرا۔ میں لپکی مگر بے شمار لوگوں نے ہاتھ پھیلا کر اسے بچا لیا۔ ددا نے میری طرف دیکھا اور ہنس دی۔ ساس نے تیور چڑھا لئے۔ میں وہیں بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ نیچے دیکھا تو وہ لڑکا کہیں بھیڑ میں گم ہو چکا تھا۔ میں یونہی مورکھوں کی طرح اس طرف دیکھتی رہی۔ جی چاہا نیچے لپک جاؤں اور اسے ڈھونڈ ڈھانڈ کے پوچھوں کہیں بہت تو نہیں لگی؟ مگر میں یہاں سے ایک دم کیسے جا سکتی

تھی باہر؟ صدیوں کی بنی رسم کو پل بھر میں کیسے توڑ دیتی؟ من کو مار کے یہیں بیٹھی اور سوچتی رہی۔

رات آ گئی ___ اشٹمی کی رات۔ میری طبیعت جب تک بہت بوجھل ہو چکی تھی۔ تنکا توڑ کر دھرا نہ کیا تھا لیکن اتنی تھک گئی تھی کہ بس۔ آج گھر میں ایک ہی چیز کام کی ہوتی اور وہ یہ کہ ارھر کی دال نہ پکی تھی اور نہ آنڈا نہ کڑھی۔ میری جٹھانی نے کٹھل کی وہ پیاری سبزی بنائی تھی کہ زبان سے الگ نہ ہوتی تھی بالکل مالنس کا مزا تھا۔ ہاں، بالو کی ماں! تم سے کیا چھپانا، میں نے کھایا ہے۔ چوری چوری کئی بار کھایا ہے۔

روپ بو آ گئی، ویسے ہی بے وجہ ہنستی ہوئی۔ یہاں بستر سے اُٹھنا دوبھر ہو رہا تھا لیکن وہ تھی کہ اپنے سبک پاؤں پہ ادھر سے اُدھر، اُدھر سے ادھر پھسلتی جا رہی تھی۔ اتنی چہک اس میں کہاں سے چلی آئی؟ میری طرف دیکھ کے وہ شرارت سے مسکرائی اور بولی۔

"بھیا کب آنے والے ہیں چھوٹی بھابی؟"

میں نے کہا۔ "کیوں۔"

روپا سمجھی تھی کہ اس کے بھائی کے نام پہ میں شرما جاؤں گی؛

جیسے دوسری عورتیں اپنے مرد کے نام پہ شرما جاتی ہیں، مگر ہماری شادی اب کوئی نئی بات نہ تھی اور شرمانے کی اتنی بات ہی کہاں رہی تھی۔

رُوپا بولی، "بینا بھی ہے، آج منڈولے ہیں؟ وہ جھونٹا دینی کہ آسمان سے جا لگتیں۔"

"اُونہہ!" میں نے بیزاری سے کہا اور چپ ہو گئی۔

رُوپا جنم اشٹمی کے دن مجھے اور اپنے بھیا کو ہنڈولے میں بٹھا کر بڑی خوش ہوتی تھی۔ پتا نہیں اسے کیا سواد آتا تھا۔ شاید یہ سمجھتی ہو گی۔ رادھے شام کی جوڑی ہے۔ جب کہیں لمبا اور تیز جھونٹا دیتی تو میں ڈر کر ان سے چمٹ جاتی اور رُوپا دیکھ کر بہت ہنستی۔ بیچ بیچ میں ایک دو بار گر گئی اور یہ مجھے تھام بھی نہ سکے۔ میری جیٹھانی کے بچوں نے بیر کھا کھا کر گٹھلیاں جگہ جگہ پھینک رکھی تھیں ایک میرے سر میں گھس گئی۔ جب سے میں نے جھولے ہنڈولے پہ بیٹھنا ہی چھوڑ دیا۔ بیٹھتی بھی تو ان کا سہارا لینے کے بجائے رسہ تھام لیتی، جس سے رُوپا کا سب تماشا ختم ہو گیا۔

رُوپا بیٹھی رہی اور ہر قسم کی شرارتیں کرتی رہی۔ کبھی وہ

میرا کے بھجن گانے لگتی، کبھی باجے میں فلم کا ریکارڈ لگا دیتی اور تالی بجا بجا کر ساتھ ناچنے لگتی۔ آج وہ بہت خوش تھی۔ جب تک ان کے پتا اور بڑے بھائی آ گئے تھے۔ میں جانتی تھی۔ دادا، ساس اور جیٹھانی ہنڈ دے دیکھنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ میں سوچ رہی تھی۔ اب سانول داس کے دیول جانے کے لئے کہا تو میں کیا بہانہ کروں گی۔ جبھی مجھے اس لڑکے کا خیال آ گیا۔ جس نے ٹکٹکی چھوڑی تھی۔ میں نے بڑے پیار سے روپا کو بلاتے ہوئے کہا۔

"روپو ــــ تو نے دیکھا تھا جلوس؟"

روپو نے ایک دم چونک کر میری طرف دیکھا اور بولی،

"ہاں، بھابی!"

میں نے پوچھا، "اور وہ تہپالی دیکھی تھی؟"

روپا بولی، "ہاں۔"

"اور وہ لڑکا؟"

روپو نے پہلے انکار میں سر ہلا دیا اور پھر اقرار میں وہ اتنی جلدی میں تھی کہ کچھ فیصلہ ہی نہ کر پائی۔ اس نے تیز سی نظر مجھ پر پھینکی، اور چپ کھڑی ہو گئی۔

میں کچھ نہ سمجھی، الٹا میں ہی پوچھنے لگی، "کون لڑکا بھلا؟"

روپو نے منہ دوسری طرف کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے کیا معلوم؟"

"ارے وہی،" میں بولی، "مٹکی پھوڑ۔"

اور صرف روپا کو چھیڑنے کے لئے میں نے کہہ دیا۔ "کیسے تمہاری طرف دیکھ دیکھ کے ہاتھ ہلاتا تھا، اشارے کرتا تھا، جیسے اچھی طرح سے جانتا ہو۔" میں چاہتی تھی، روپا مجھے چھیڑے، مجھے کہے وہ تمہیں بلا رہا تھا، بھابی! مگر روپا چپ رہی۔

نہ صرف چپ، اس کی سانس تیز ہو گئی۔ اس نے پھر مجھے دیکھا جیسے میرے اندر کی کوئی چیز ٹٹول رہی ہو۔ ایک پل کے لئے تو میں بھی گھبرا گئی، پھر میں نے سوچا، میں نے کیا کیا ہے، جو خواہ مخواہ کی چور بنوں؟ میں نے دلیری سے روپا کو اور بنانا شروع کیا جب وہ بہت گھبراتی تو میں سمجھی اس کی تو عادت ہے۔ مجھے کیا پتا۔ آج کیا ہونے والا ہے۔ میں نے مسکراتے، سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "کیسے سر مار مار کے مٹکی پھوڑی تھی اس نے؟"

روپا اسی طرح اٹھ کھڑی ہوئی اور جانے لگی۔ میں نے دیکھا پہلو سے اس کی دھوتی پھٹی ہوئی تھی اور اس سے پرے کچھ خون کے دھبے تھے۔ روپا ایک سال سے رجولا تھی۔ میں نے کہا، وہ پھر

شروع ہو گیا ہے اور یہ پھوہڑ نہیں جانتی،
"دھوتی تو بدل، کبتیا!" میں نے لفظوں کو ٹھوڑا اچھالتے ہوئے کہا، "پھٹی پڑی ہے، سب لہو لگا ہے۔"

روپا کچھ مڑی اور دھوتی میں پھٹی ہوئی جگہ اور خون کے نشانوں کو چھپاتے ہوئے ہڑبڑا کر باہر نکل گئی۔

میں نے اس واقعے کو کوئی خاص وہ نہ سمجھا۔ ایسا تو قریب قریب ہر لڑکی کے ساتھ ہوتا ہے۔ جب وہ عورت بنتی ہے۔ ہولے ہولے وہ اپنا آپ سنبھالنا سیکھ لیتی ہے۔ کئی جب بھی پھوہڑ ہی رہتی ہیں۔ میں نے سوچا، یہ بھی پھوہڑ ہی رہے گی ــــ روپا!

رات جو کچھ ہوا، اس سے مجھے پتا چلا یہ سب جادو کبتیا کے شبد نے جگایا ہے۔ مجھے کیا پتا بالو کی ماں۔ تو تو جانتی ہے ہم یونہی پیار سے بھی ایک دوسری کو کبتیا کہا کرتی ہیں۔ میرا یہ مطلب تھوڑی تھا؟ ہم ہنڈولوں پہ گئے۔ روپے پیسے، سونے چاندی کی ہمارے دیس میں کیا کمی؟ کنجوس لوگ، پیسے پیسے کے لئے مرنے والے شادی بیاہ، تیج تہوار پہ سب کونوں کھدروں میں پڑی دولت اٹھا لاتے ہیں اور بیچ چوراہے پہ رکھ دیتے ہیں، گویا کہہ رہے ہوں۔ دیکھو، دیکھو اور جلو۔ میں کیرت داس ہوں۔ جس کی دھن

باد میں تین کوئلے کی کانیں ہیں، کلکتے میں ربڑ اور پلاسٹک کا سب سے بڑا کارخانہ، بمبئی میں کاٹن گرین کے گودام اپنی روئی سے بھرے پڑے ہیں۔ تو سانول داس کے دیول میں لاکھوں کا چڑھاوا چڑھ گیا۔ میرے سسر نے مورتیوں پر سونے کا پنجرا جڑوا دیا اور شیام سندر کی آنکھوں میں بڑے بڑے نیلم لگوا دیئے۔

میں اگرچہ تھکی ہاری تھی، مگر ساتھ چلی گئی تھی، یوں ہی ایک امید کے ساتھ —— اور کچھ نہیں تو رونق دیکھ لوں گی۔ گھر میں کیا رکھا ہے؟ پڑی رہی تو اپنے آپ کو کھا جاؤں گی۔ وہاں بھیڑ میں دو چار دھکوں کے سوا اور کچھ نہ ملا اور اس کے بعد ہم گھر چلے آئے روپا نہیں آئی تھی، سب منت سماجت کرتے رہے مگر روپا نے ایک ہی نہ پکڑ لی۔ سب جانتے تھے یہ ایسا ہی کرتی ہے اس لئے ساری پروا کے ہوتے ہوئے بھی کسی نے پروا نہ کی۔

لوٹتے سمے اور گھر پہنچ کے میں نے بار بار سوچا۔ یہ ہی آجائیں مگر انہیں کیا پڑی تھی؟ انہیں تو دلیس بھر کی انڈی چاہیئے تھی۔ دنیا بھر کی دولت۔ پیسے، پیسے اور پیسے کے سوا انہوں نے کچھ سوچا نہ ان کے باپ دادا نے ہماری کتنی خواہش ہوتی ہے، بالو کی ماں ہم اپنے پتی کے ساتھ باہر جائیں۔ میں تو کہتی ہوں۔ اس بات

میں پتی پریم بھی اتنا نہیں ہوتا جتنا یہ خیال ہوتا ہے کہ باہر جائیں اپنا آپ دکھائیں، اور جب کوئی بہت دیکھے تو اپنے ہی مرد کے کندھے پر ہاتھ رکھ لیں اور کہیں، "بھگوان نے سب دیا ہے، تم کیا سمجھتے ہو؟ تم بیٹھو، ٹھنڈی سانسیں لو۔ آئیں بھرو، جلو مرو——"

ہاں، اتنا ہار سنگار، زیور کپڑے کیوں پہنتی ہیں؟ اسی لئے نا کہ کوئی دیکھے مگر ہاتھ نہ بڑھائے اور پھر اس سارے انکار میں اقرار چھپا ہوا من کے کسی کونے میں ایک چیز پڑی رہتی ہے جو ہر آتے جاتے من چلے کی ہمت کو للکارتی ہے۔

گھر آتے ہی میں سیدھے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اندر سے دروازے بند کر کے میں نے اپنے سب کپڑے اُتار دیئے اور آئینے میں اپنا آپا دیکھنے لگی۔ کبھی ادھر سے کبھی ادھر سے پھر بتی بجھا کر ایسے ہی بستر میں لیٹ گئی۔ باہر کسی نے ہلکے سے دروازہ کھٹکھٹایا۔

میں چونک اٹھی۔ "کون؟" میں نے پوچھا۔

آہستہ سے آواز آئی، "میں —— روپا۔"

میں نے پاس پڑی چادر لپیٹ لی اور اٹھ کر دروازہ کھولا روپا اندر آئی۔ وہ رو رہی تھی —— زار زار رو رہی تھی ——

آتے ہی وہ میرے قدموں پر گر پڑی اور بولی۔ "میری لاج رکھ لو بھابی! میں مر جاؤں گی۔ کسی سے کہہ دیا تو میں کہیں کی نہ رہوں گی۔"

میری سمجھ میں جب تو کوئی بات نہ آئی مگر ہم عورتیں؟ میں نے یوں ہی کہہ دیا۔ "نہیں، میں کسی سے نہ کہوں گی۔" اور پھر یوں ہی، یوں ہی، "کیا ہوا؟" روپا بولی۔

"تم ٹھیک کہتی ہو بھابی، وہ مجھے جانتا تھا۔"

"وہ کون؟" میں نے پوچھا۔

"اب بنو مت" وہ بولی، "وہی مٹکی پھوڑ۔"

تیرا ستیاناس! میں نے دل میں کہا۔

روپا بولی۔ "جب بھی رادھا بازار سے گزرتی ناکے پہ مجھے مل جاتا، اشارے کرتا، سیٹیاں بجاتا لیکن میں پاس سے گزر جاتی، برے برے منہ بناتی، گالیاں دیتی، لیکن آج پتا نہیں مجھے کیا ہوا میں بھیڑ میں چلی گئی، صرف اس کے انگلی اٹھانے پہ اور پھر ہم دونوں بھیڑ سے نکل گئے اور شومندر میں چلے گئے۔ جہاں مسافروں کے لئے کوٹھڑیاں بنی ہیں۔ میں کانپتی جا رہی تھی۔ آخر میں نے سوچا بھی کہ بھاگ کھڑی ہوؤں مگر مجھے کچھ کرتے نہ بنی۔ اس کے بعد میں

اندھی ہو گئی!"

میں سچ کہتی ہوں بالو کی ماں! میرا سارا بدن کانپنے لگا۔ پہلے مجھے غصہ آیا، نفرت پیدا ہوئی، پھر سب کچھ جانے کیسے اپنے آپ ڈھل گیا۔ میں جی ہی جی میں اپنی مورکھتائی پہ ہنسی۔ سب مجھے جبھی کیوں نہ پتا چلا۔ جب میں نے روپو سے یہ سب کہا تھا؟ ابھی بارہ دن ہی تو ہوئے تھے۔ جب روپو نہائی.... اور آج.... "اچھا، اچھا تو فکر نہ کر" میں نے روپو سے کہا، "مگر اب تو اپنا آپا سنبھال۔ مہینہ بھر اپنا حال بناتی رہنا، مردی۔ کچھ ہو گیا تو کہیں کی نہ رہ جائے گی۔ صبح میں تجھے میتھرے اُبال کر دے دوں گی۔ اب تو سو رہ یہیں، میرے پاس کہاں جائے گی؟ اسی کوٹھی میں؟ سب سوچیں گے یہ کیا ہو رہا ہے؟ کون چل رہا ہے اس آدھی رات کے وقت؟

"اور سن! میں تیری شادی کی بات چلاؤں گی تو اُدوں آکی مت کیجیو۔ کرنا بھی ہے تو بس دکھاوے کے لئے، اتنا ہی جتنا ہم سبھی کرتی ہیں، ٹلکی بھوڑ یونہی سا ہے کوئی راج مجبور اس کا تو سوچ بھی مت۔ ہاں، جو بات اچھی نہیں ہے اچھی نہیں ہے اور جو اچھی ہے سو اچھی ہے۔ بھگوان نے تو مرد عورت کو بنا دیا اور جب سے دنیا بنی ہے وہ ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے ہیں اور بھاگتے

رہیں گے، جیسے چاند سورج بھاگتے ہیں، لیکن وہ بھی ایک راستے پہ جاتے ہیں۔ یہ نہیں اس گلی، اس بازار سے راستہ کاٹا اور پکڑ لیا ایک دوسرے کو ایسا ہو تو یہ دنیا، یہ سنسار، یہ دھرتی، یہ آکاش —— سب نشٹ ہو جائیں۔ سال کے دن کتنے ہوتے ہیں؟ تین سو پینسٹھ ان تین سو پینسٹھ دنوں میں ایک بار چاند سورج کو اور ایک بار سورج چاند کو پکڑ لیتا ہے اور بس، اس لئے انسان نے اس چاند سورج کا بھی راستہ بنا دیا ہے اور وہ ہے شادی کا راستہ اس کے سوا کوئی دوسری چیز نہیں۔ شادی ہوتی ہے تب ماں باپ بھائی بہن خود لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر لڑکے کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں پھر تو کوئی راجہ مہاراجہ، جج دیوان بھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

اور میں نے روپا کو چھاتی سے لگا لیا۔ اس کی بہت کچھ تسلی ہو گئی تھی۔ میرے پاس پڑے وہیں سو گئی۔ نیند نہ آئی تو مجھے بوسی جمائیاں لیتی اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر پہلو بدلتی رہی کبھی کبھی میرا ہاتھ روپا کے بدن پر پڑ جاتا، مگر وہ بے ہوش پڑی تھی۔ سب کچھ کرشن کے ایک سکھ کی نیند لے رہی تھی اور میں۔

مٹکی پھوڑ —— روپا کے بھیّا —— روپا —— آئینے میں اپنا بدن یہ سب کچھ آنکھوں کے سامنے گھومتا رہا۔ پھر میں سوچنے لگی

یہ جو روپا سے کہتی رہی ہوں، سچ بھی ہے اور جھوٹ بھی، سچ اس لئے کہ کوئی قاعدہ قانون تو ہونا چاہیئے، یوں ہی مرد عورت ایک دوسرے سے ملتے پھریں تو اولاد کون سنبھالے؟ کنبہ کیسے بنے؟ اور جھوٹ اس لئے کہ شادی کے ایک دو سال تک سب ٹھیک رہتا ہے، پھر ہولے ہولے مرد عورت ایک دوسرے کو اتنا جان لیتے ہیں کہ پھر جاننے کی بات بھی نہیں رہتی، جیسے کوئی آدمی، ہر سال آبو جایا کرے یا سوسر کی تحصیل کے ہزاروں چکر کاٹ ڈالے پھر مسوری کی گھاٹیوں ہی پر چڑھنے کا مزا ہے، نہیں روح سو جاتی ہے اور ہولے ہولے جسم بھی مردہ ہو جاتا ہے، جبھی تو کسی دوسرے کا ہاتھ لگے تو جسم اور روح دونوں چونک کر جاگ اٹھتے ہیں، بیاہتا جیون میں یہ سب ہو سکتا ہے اگر عورت مائیکے ہی جاتی رہے، چاہے وہ صبر کا مائیکہ ہو یا مرد دورے پر چڑھا رہے کسی ایسی بڑی ریلوے کا گارڈ ہو جو مہینوں بعد گھر لوٹتی ہو، جب بھی تبدیلی قانون ہے قدرت کا، ہمیشہ گرمی نہیں رہتی، نہ سردی رہتی ہے، شکل پکش کی رات کا اپنا جادو ہے اور کرشن پکش کی رات کا اپنا، سانپ کی کھال بھی اچھی ہے اور مور کے پنکھ بھی، پھر رنگ ہیں خوشبوئیں ہیں، آوازیں ہیں ــــ ان جانی، ان گنت ۔

شادی بہت اچھی چیز ہے بالو کی ماں، پر کیا سماں نہیں آیا۔ اس میں تھوڑی سی تبدیلی آجائے؟ یہ مرد عورت دونوں سے ایک ہی بات کہے۔ اس چھت کے نلے تم دونوں رہو گے۔ یہاں جو بچے پیدا ہوں گے انسان ہی کے ہوں گے۔ مرد باہر کام پہ جایا کرے گا، عورت گھر سنبھالے گی، اور بس۔ ہے بھگوان! میں کیا کچھ کہہ گئی، میرا منہ دیکھو بالو کی ماں جوان بالوں میں سے ایک بھی کسی سے کہو۔ میں سچ کہتی ہوں، مجھے کئی بار خیال آتا ہے، میں بیوی ہونے کی بجائے ان کی پریتما ہوتی تو کتنی خوش رہتی!

ساری رات میں نے جاگ کے کاٹی۔ ساری رات میں سولی پڑتنگی رہی۔ جب صبح ہوئی تو بہ چلے آئے۔ میں لپک کر دروازے کی طرف گئی، مگر انہیں مجھ سے بات تھوڑی کرنا تھی۔ میری طرف تو دیکھا بھی نہیں۔ یہ آنکھوں ہی آنکھوں میں اتنا ہی کہہ دیتے کہ ہاں بھئی تو بھی کوئی ہے۔ باہر جانے والے کا کیا ہے؟ ہزار شکل دیکھ کے آتا ہے۔ ہم ہی گھر میں ایک دوسرے کا منہ تکا کرتی ہیں اور پڑے پڑے باسی روٹی کی طرح ہو جاتی ہیں۔ ہاتھ لگاؤ تو ٹھنڈی ٹھار کھاؤ تو کرما گرم۔

ارنڈی کا سوداگر! ہونہہ۔ پگڑی تو دیکھو، کیسے پیچ کے پیچ گلے میں پڑے ہیں، جیسے مار کھا کے آیا ہے اور منہ پر انجن کے کوئلے کا برادہ کھنڈ گیا ہے۔ کوئی جم دوت معلوم ہوتا ہے، پتنگ کا بھوت !

کمرے میں اور کسی کے جانے کی ہمت نہ تھی، سوائے ددا کے ددا گئی تو اسے بولے "ددا جی اسے کھو کچی لسی کا گلاس بنا دے۔"

اس ساری نفرت کے باوجود میں اپنے آپ چل دی، لسی بنانے وہی، صدیوں کی عادت پل بھر میں تھوڑی چلی جاتی ہے؟ میں نے جی میں کہا۔ بڑا آیا ہے حکم چلانے، جیسے میں کوئی لونڈی ہوں، ہاتھ جوڑے کھڑی ہوں، حکم کی دیر ــــ مگر میں نے جلدی سے کچی لسی بنا ڈالی۔ رو پا ابھی جاگی تھی۔ لیک کے باہر جو نکلی تو گلاس سے ٹکرائی لسی سے میرے کپڑے تر ہو گئے۔ پھر جو بچی تھی بھیج دی۔

میں تمہیں سچ کہتی ہوں، بالو کی ماں! رات تک یہ باپ اور دونوں بیٹے باہر نہیں نکلے۔ آپس ہی میں کچھ کھسر پھسر کرتے رہے میں نے سوچ لیا یا گھر سونے کی اینٹوں سے بھر گیا اور یا پھر سب کچھ بک گیا۔ یہ ارنڈی چیز ہی ایسی ہے۔ اگر تم اسے دیکھو تو بالکل پتا نہیں چلتا۔ کسی کی قسمت بنا سکتی ہے یا بگاڑ سکتی ہے ہمارے دیس کی ارنڈی، تو رپے، مونگ پھلی میں وہ طاقت

ہے جو کسی دوسرے دلہن کی دودھ بالائی میں نہیں، کسان ہل جوتتے ہیں، بیج بوتے ہیں، کارخانوں میں مجور محنت کرتے ہیں لیکن ان کی قسمت کے فیصلے ان کمروں میں بیٹھے یہ سیٹھ لوگ کر ڈالتے ہیں جو ہل چلانے میں نہیں، بونے میں نہیں، محنت مجوری کرنے میں نہیں۔

میں چاہتی تھی باہر آئیں تو آج ذرا ان سے دو باتیں کروں اور کہوں۔ پیسے کے پجاریو! ایسی دنیا بھی ہے جو پیسے کے سامنے ماتھا نہیں ٹیکتی۔ جیب سے پیسے نکال کر یوں پھینک دیتی ہے۔ مطلب کی چیز خرید لیتی ہے اور پھر چل دیتی ہے۔ آگے دیکھو تو تمہارے گھروں میں کیا ہو رہا ہے؟ ہیروں، سونے چاندی ہیرے، جواہرات کی کھان میں تم نے ہم سب کو قید کر دیا ہے اور ہم بھوکوں مر رہی ہیں۔ ہیرے جواہر تو نہیں کھا سکتیں۔

وہ نکلے، باپ اور دونوں بیٹے، چہرے پر خوشی نہ رنج اور پھر گھر سے باہر چل دیئے۔ ہم عورتیں ہکا بکا کھڑی رہ گئیں آج ادھر میں کچھ کالا کالا ہے۔ دوا آئی اور بولی۔ دوا انڈری، ہیں دس بارہ لاکھ کا گھاٹا پڑا ہے اور یہ لوگ دیوالے کے کاغذ لکھنے جا رہے ہیں۔ کل کچہری کھلے گی تو داخل کر دیں گے۔"

دیوالہ! ایسے کیا دیکھ رہی ہو بالو کی ماں؟ تمہارے لئے دیوالہ مر جانے کی بات ہے "ان سیٹھوں کے لئے نہیں"۔ یہ تو جتنے دیوالے نکلیں اتنے ہی امیر سمجھے جاتے ہیں۔ بات یہ ہے۔ ہر دیوالے میں یہ کچھ اور یہ بیچ کر جاتے ہیں جس سے لاکھ دو لاکھ کا فائدہ ہی ہوتا ہے، نقصان نہیں۔ اس سے پہلے میرا سسر اور اس کے بیٹے چار دیوالے نکال چکے تھے اور یہ پانچواں تھا۔

رات بھر یہ "مرد لوگ" نہ آئے۔ دن بھر کچہری میں رہے۔ شام کو میں اسی سنجار چے میں بیٹھی تھی، سامنے اپنے سسر کو آتے دیکھا، کمر کی طنابیں ڈھیلی کرتے ہوئے میرے جیٹھ کی موٹے شیشوں والی عینک ناک کی چونچ پر آ گئی تھی اور یہ! ان کے منہ پر ٹھوڑی اور گال لٹک کھنڈ گئی تھی۔

دو سال تک انھوں نے روپا کا کچھ نہ کیا۔ میں نے پہلے اس بے چاری کے خیال سے صاف صاف کچھ نہ کہا۔ اشارے اشارے میں سب کہہ دیا مگر انھوں نے ایک نہ مانی۔ کوئی امیر گھر دیکھنے میں وقت ضائع کر دیا۔ روپا نے اتنے عرصے میں زمین آسمان تک ایک کر دیا۔ اسے اب ہر آدمی مٹکی پھوڑ نظر آتا تھا۔ کب تک گلی محلے کی نظروں سے یہ بات چھپی رہ سکتی تھی؟ آخر ایک دن

تینوں باپ بیٹوں نے مل کر روپا کو خوب پیٹا۔ چھڑانے میں مجھے بھی پڑ گئیں۔ پھر انہوں نے اسے ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا۔

روپا کو تو کچھ زیادہ محسوس نہ ہوا، میں پاگل ہو گئی۔ اندر جاتی تو رو دیتی، باہر آتی تو رو دیتی۔ میں نے ساس کی منتیں کیں، ددا کے سامنے ماتھا رگڑا اور کہا "کیا یہ ضروری ہے؟ اچھا سا لڑکا دیکھو جو کھاتا کماتا ہو، باپ سیٹھ نہ ہو تو کسی اچھی نوکری میں ہو۔"

لیکن یہ کسی ایسے کی تلاش میں تھے جو ان ہی کی جات برادری کا ہو، جن سے بیوپار کا رشتہ بڑھے۔ مگر ایسا کون نہ تھا۔ تھا بھی تو بڑی ناک والا، بہت پیسے مانگتا تھا۔ لاکھ دو لاکھ کی بھی بات نہیں ــــ پانچ لاکھ۔

روپا کھل کھیلنے لگی۔ اس نے صاف کہہ دیا کہ شادی کروں گی تو اسی مٹکی پھوڑ سے۔ مٹکی پھوڑ کا اصل نام شیتل داس تھا اور وہ آتش بازی کی دکان کا مالک تھا۔ آمدنی کوئی اتنی زیادہ نہ تھی لیکن دیوالی کے ادھر اُدھر اتنا پیسہ کما لیتا تھا کہ سال بھر کے لئے کافی ہو۔ خود شیتل داس تھا۔ مگر کام ہوائی پٹاخے کا اپنا من شیتل ہو یا نہ ہو لیکن دوسرے کا ضرور کر دیتا تھا۔ دیول نگر میں دو چار ہی بانکے تھے۔ جن میں سے ایک وہ بھی تھا۔ ہر کھیل تماشے

میں آگئے، اور اس لیلا کا بندوبست اس کے سپرد، وہ مہا بھارت کا کنس تھا تو راماین کا راون۔
لیکن روپا اب اسے نہ مل سکتی تھی نہ اسے گوکل اشٹمی کے دن سانول داس کے دیول میں جانے کی اجازت تھی اور نہ راس لیلا، دسہرے میں حصہ لینے کی چھٹی۔ مجھے تو اسے دیکھ دیکھ کر ترس آتا تھا۔ میرے دل میں جانے کیا کراتی کی لہر اٹھی، شو مندر جانے کے بہانے میں نے کپڑے پہنے اور چل نکلی۔ شنیل کی دکان رادھا بازار اور رگھوناتھ بازار کے سنگم پہ تھی۔ جہاں مہا بیرجی کا مندر ہے اور لال رنگ بکھیرا رہتا ہے، ہر آتے جاتے کو لگتا ہے۔ کاربیوہار پہ آنے جانے والے لوگ وہاں تھوڑی دیر کے لئے کھڑے ہوتے ہیں، ہاتھ جوڑتے ہیں، آنکھیں بند کرتے ہیں، اور کچھ دیر کے بعد زنجیروں سے لگی ہوئی گھنٹیوں کو بجاتے اور چل دیتے ہیں۔ سامنے دائیں، بائیں اور پیچھے گائیں بیٹھی جگالی کرتی ہیں اور انہیں کوئی نہیں روکتا۔ کمیٹی بھی کچھ نہیں کر سکی — کوئی موٹر، تانگے والا آتا ہے تو رک جاتا ہے اور پھر گاڑیوں کو ادھر اُدھر سے گھما کر اپنا راستہ بناتا اور چل دیتا ہے۔
میں جا کر شنیل کی دکان پہ کھڑی ہو گئی۔ کئی لڑکے اس کی دکان

ہر کام کرتے تھے۔ وہ صرف اپنے بالوں میں کنگھی کرتا اور لڑکوں کو موٹی موٹی گالیاں دیتا تھا۔ دسہرے کے اِدھر اُدھر کے دن تھے اور شتبل داس نے دکان کے سامنے ایک طبیلے میں بانس اور کاغذ رکھے ہوئے تھے۔ میگھ ناد اور ببھیشن بن چکے تھے اور اب راون بننے جا رہا تھا۔

مجھے سامنے دیکھ کر وہ بولا۔ "کیا چاہیئے؟ پھل جھڑیاں؟"

میں نے کہا۔ "پھل جھڑی لینے نہیں آئی، دینے آئی ہوں۔"

وہ کچھ نہ سمجھا۔ دکان سے نیچے اُتر گیا۔ میرا تن بدن کانپ اُٹھا۔ میں پرے منہ کر کے راون کے ڈھانچے کی طرف دیکھنے لگی۔ جس نے طبیلے کا تین چوتھائی گھیر رکھا تھا۔ دس سر لگنے والے تھے اور اِدھر گدھے کا سر لگنے سے پورا طبیلہ گھر سکتا تھا۔ میں نے جلدی جلدی شتبل داس کے سر کی طرف دیکھا، ہر سال سینکڑوں ٹمکیاں پھوڑنے سے جس پہ چھوٹے چھوٹے زخموں کے نشان پڑ گئے تھے پھر میں نے جو کہنا تھا چپکے سے کہہ دیا شتبل داس کا چہرہ چمک اٹھا اور میں چلی دی۔

شام کو بھاٹ چلے آئے جو ہر سال ہمارے گھر میں آلا اودل سنایا کرتے تھے اور جسے سن کر ہمیں بڑا جوش آتا تھا۔ ان میں

سے ایک تھا جو خنجری بجاتا تھا، اور وہ شنیل تھا۔ چونکہ یہ سب لوگ گھر کے اندر تھے اس لئے روپا انھیں دیکھ سکتی تھی۔ شنیل کو دیکھتے ہی وہ کانپنے لگی۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ میں منہ بھینچ کر ہنس دی تھی۔

گھر بھر میں کوئی بھی شنیل کو نہ پہچان سکا۔ پڑوسنیں بھی اسے نہ جان پائیں۔ کمبخت ایسا بہروپیا تھا کہ کسی کو شک بھی نہ ہوا۔ ایک پہچانا تو پہچاننے والی نے جو اس کے ایک ایک بل سے واقف تھی۔ روپا اندر بھاگنے لگی۔ میں نے اشارے سے منع کر دیا۔

میں کہتی ہوں، بالو کی ماں، مجھے اس میں ذرا بھر بھی لاج نہ لگی اور نہ ایسا معلوم ہوا جیسے میں نے کوئی پاپ کیا ہے۔ اُلٹا یوں جان پڑا جیسے کوئی بہت بڑے پن کا کام کر رہی ہوں ہمارے شاستر اس طرف تھے اور ددا، ساس، جیٹھانی، سسر، جیٹھ — یہ سب دوسری طرف۔ میں نے وقت کا ایسا بند وبست کیا تھا۔ کہ ان کے آلا اودل شروع کرنے سے ختم کرنے تک رات ہو چکی تھی۔ اس کے بعد میں نے دیکھا عورتوں میں سے روپا غائب ہے اور مردوں میں سے شنیل۔ باقی کے بھاٹ تلسی جی سے کچھ پڑھتے رہے۔

جب بہت دیر تک نہ آئے تو میں گھبرا گئی۔ اُٹھ کے گئی تو دیکھا روپا اپنے کمرے میں لیٹی ہوئی چھت کو تک رہی ہے۔ میں نے اشارے سے پوچھا۔ وہ کہاں گیا؟ روپا نے بتایا پیچھے سیڑھیوں کے راستے سے غائب ہو گیا ہے۔ میں سمجھی بس مل لیا دونوں نے اور کوئی بات نہیں ہوئی۔ مگر مجھے کیا پتا بات کہاں سے کہاں تک جا پہنچی ہے

گھر کے مرد لوگ سیڑھی پر سے چلے آئے۔ میں سچ کہتی ہوں اس روز مجھے روپا کے بھیّا برے نہ لگے۔ انہیں خود بڑی حیرانی ہوئی کہ یہ آج اتنا پھسلا کیوں رہی ہے۔ میں بڑی خوش تھی، جیسے کچھ مل گیا ہے۔ مل بھی جاتا تا بالو کی ماں تو اپنے آدمی کے لئے میرے دل میں پیار کم ہو جاتا؟ بالکل نہیں، اُلٹا بڑھتا ہی۔ میں سوچتی۔ میں کیا کر آئی ہوں۔ ان بے چاروں کو کیا معلوم؟ جو لوگ عورت کو جنتی نہیں سمجھتے، بیوپار جائیداد کی چیز سمجھتے ہیں، جن کے دماغ میں شادی کا وہی پرانا مہتو گھسا ہوا ہے جو آج سے ہزاروں سال پہلے تھا، انہیں اس بات کی کیا سمجھ؟

رات دو بجے میں ہڑبڑا کے اُٹھی۔ گھر بھر میں شور مچا ہوا تھا روپا شیتل کے ساتھ دوڑ رہی تھی کہ پکڑی گئی۔ میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے۔ روپا سے ہر طرح کے سوال کیئے جا رہے تھے

مگر اس نے ایک ہی چپ لگا رکھی تھی۔ وہ ڈھیٹ بن گئی تھی
اس کا انداز کچھ ایسا تھا کہ کر لو جو میرا کرنا ہے۔ میں تو وہی کروں
گی جو میرے من میں ہے۔

ایک بات اچھی ہوئی جو شتیل نکل چکا تھا۔ اس کے بارے میں
کسی کو پتا نہ چلا۔ وہ ہوتا تو سب کہہ ڈالتا۔ اسے کیا پڑی تھی؟ وہ
تو رستیا تھا۔ باقی رہی روپا کی بات، روپا کو کوئی مار بھی دیتا تو
میرا نام نہ لیتی۔ وہ اتنی ناشکری نہ تھی۔

اب سب کو ہاتھ پیر پڑ گئے۔ اتفاق سے دوسرے ہی دن
گھر کے نائی نے بالا گھاٹ میں ایک رشتہ بنا دیا۔ ایسے سیٹھ
کا نام لیا جس کے چھ دیوالے نکل چکے تھے، جو ہنڈیوں کا بیوپار کرتا
تھا۔ سب کچھ جلدی سے طے ہو گیا۔ روپا کو منانے کا کام میرے
سپرد کیا گیا۔ روپا کچھ مانی کچھ نہ مانی اور دنوں ہی میں برات
بھی دروازے پر آ گئی۔

میں نے لڑکا دیکھا تو میری طبیعت خوش ہو گئی۔ شتیل تو اس
کے مقابلے میں کچھ نہ تھا۔ یہ جوان، خوبصورت، لمبا چوڑا۔ میں روپا
کے پاس بھاگی گئی اور اسے سب بتا دیا۔ روپا مسکرا دی ——
ایک روکھی پھیکی مسکراہٹ میں تو ناچ اٹھی، جیسے روپا کی نہیں

میری شادی ہونے جارہی ہے!

تم نے تو وہ شادی دیکھی ہے، بالو کی ماں؟ وہ شادی دیول نگر میں یادگار رہے گی۔ ان کے پتا نے وہی کیا جو ہماری جات برادری کے لوگ کرتے ہیں۔ ایک لاکھ روپیہ لگا دیا۔ گھر میں کس نے نہیں کھایا؟ کون لاگ لے کے نہیں گیا؟ ہمیں وارکرنے، چھیڑنے کی پوری برات ملی اور پھر وہ ——— دولھوں کا دولھا۔ وہ ہنگامہ ہوا، وہ شور مچا کہ بس، بینڈ، باجے، اگالے، روشنیاں میری جیٹھانی کے بچے خوش تھے۔ میں نے بلرام کو بلایا اور کہا، "دیکھ ننھے، تیری بوا کی شادی ہو رہی ہے۔" اس بے چارے کو کیا پتا کیا ہوا اور کیا نہیں ہوا اور کیا ہونے جارہا ہے؟ وہ خوش تھا ہاتھ میں ایک بڑا سا حیسو تھامے اس نے صرف اتنا سا کہا۔

"میں شادی بھی کروں گا چاچی۔"

میں نے کہا۔ "کس سے؟"

بولا۔ "بوا سے۔"

"دہشت!" دادا جو پاس کھڑی تھی بولی۔

ڈولی گئی۔ وہ آتش بازی چھوٹی کہ رام رام۔ پانچ ہزار کا ٹھیکہ میں نے ان کو کہہ سن کر شنیل کو دلوا دیا تھا اور وہ خود کھڑا اپنے

سامنے چکر چلوا رہا تھا جس میں سے سات رنگ کے پھول نکلتے تھے۔ ڈولی گئی! اب گھر میں دونوں، نیلوں، کاغذ کے پھولوں بیلوں پھٹے ہوئے غباروں، جلے ہوئے اناروں، چکروں کے بانسوں کانچ کے ٹکڑوں، فرنی کی پلیٹوں کے سوا کچھ نہ رہ گیا تھا۔ جتنا شور مچا تھا اتنی ہی چپ تھی۔

کہیں دو مہینے کے بعد روپا روپا آئی۔ اس کے چہرے کا رنگ ہی اور تھا۔ لڑکے نے اسے اور اس نے لڑکے کو بے حد پسند کیا تھا۔ روپا کے پاؤں زمین پر نہیں ٹکتے تھے۔ اب میں اس کے سامنے یہاں کے مٹکی پھوڑ کا نام لیتی تو روپا خود ہی منہ پر ہاتھ رکھ دیتی۔ میں نے روپا سے کہا۔ "روپ! دیکھا... میں نہ کہتی تھی؟" روپ بولی۔ "اور تو کوئی بات نہیں بھابی بابہ مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔ مگر دبو بہت ہیں۔ گھر میں کمانے والے میرے سسر ہیں اور ان کے بڑے بھائی، اس لئے ہر چھوٹی بڑی بات کے لئے انہیں ان کے سامنے سر جھکانا پڑتا ہے۔ پھر مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ان کے گھر کے بڑے ہم سے کچھ اور چاہتے ہیں۔"

"اور وہ تمہارا... ؟" میں نے شرارت سے پوچھا۔

"وہ تو کچھ نہیں چاہتے، بس،،، روپا نے کہا اور میری طرف دیکھ کے ہنس دی اور بولی،"بہت وہ کہو گی بھابی تو ماروں گی، ہاں"

میں مارے خوشی کے رو دی۔ لیکن مجھے کیا پتا تھا۔ ہمیشہ کے لئے رونا پڑ جاتے گا۔ ہائے یہ مرد! روپا چار مہینے سے یہیں ہے اور کوئی لینے والا نہیں آیا۔ وہ روپیہ مانگتے ہیں اور ہم دینے پہ تیار نہیں۔ روپا نے ٹھیک کہا تھا۔ لڑکا دبو ہے۔ بات اتنی ہے کہ اچھی شکل اور جوانی سے کچھ نہیں ہوتا۔ جب تک مرد کماؤ نہ ہو بیکار ہے انہی چند مہینوں میں روپا آدھی رہ گئی ہے وہ بچارے چے سے بھی نیچے نہیں جھانکتی۔ حالانکہ دوسرے تیسرے روز دلیول نگری کا بانکا، شیتل آتش بازہ پیار کے گانے گاتا نکل جاتا ہے۔ کل سویرے میرے سسر آئے۔ بہت خفا معلوم ہوتے تھے۔ اس نائی کو گالیاں دے رہے تھے۔ جس نے یہ رشتہ کرایا۔ کہہ رہے تھے۔
"ہم لڑکی کو کبھی نہ بھیجیں گے چاہے ساری عمر گھر بیٹھی رہے ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ روپا کے سسر کا تو ایک بھی دیوالہ نہیں نکلا۔"

صرف ایک سگریٹ

سنت رام کی آنکھ کھلی تو صبح کے چار بجے تھے۔

ساتھ کے بستر پہ دھوبن سو رہی تھی، ایک پہلو پہ دھوبن سنت رام اپنی بیوی کو کہتا تھا۔ اس کا نام تو اچھا بھلا شانتی تھا۔ لیکن سنت رام اسے اس نام سے پکارتا تھا کیونکہ وہ لانڈری میں کپڑوں کی دھلائی کے بہت خلاف تھی۔ گھر میں نوکر چاکر، پیرپاتما کا دیا سب ہوتے سوتے وہ رومال سے لے کر بھاری بھاری چادریں تک گھر ہی میں دھوتی تھی۔ جب تھک جاتی تو سب سے لڑتی اور لانڈری کے خرچ سے بہت مہنگی پڑتی۔ پھر رات کو سونے سے پہلے وہ ہمیشہ دبائے جانے کی فرمائش کچھ اس انداز سے کرتی کہ فرمائش اور حکم میں کوئی فرق ہی نہ رہتا دبانے کی اس مصیبت سے سنت رام تو کیا دھوبن کے بچوں تک کو چڑ تھی۔ کوئی پانچ نہیں تو حد دس منٹ تک دبواتے لیکن یہ کیا کہ کوئی گھنٹے بھر سے ادھر

چھوڑنے کا نام ہی نہ لے۔ عجیب تماشا ہوتا تھا۔ آخر دبانے والے کو خود بے دم ہو کر لیٹ جانا پڑتا تھا۔ ایک دن بڑی بیٹی لاڈو کے ساتھ بھی معاملہ تو ہوا۔ ماں کو دبانے کے بعد وہ ہانپتی ہوئی پلنگ کے ایک طرف جا گری اور بولی، "اب تم مجھے دبا دو، ممی"

پھر اس دبنے دبوانے کے سلسلے میں ایک اور بڑی مصیبت تھی۔ دھوبن کے پتا ہی نہ چلتا تھا کہ اسے درد کہاں ہو رہا ہے۔ جہاں ہاتھ رکھو درد ہمیشہ اس سے تھوڑے پرے ہوتا تھا اور یوں جگہ ڈھنڈواتے وہ سارا بدن دبوا لیتی تھی۔ کوئی کہے یہ اس کی چالاکی تھی تو ایسی بات نہ تھی۔ اسے واقعی پتا نہ چلتا تھا اور آخر یہ فیصلہ ہوتا کہ سارا بدن دکھ رہا ہے، اچھا، دھوبن کو دبوانے کا ہی نہیں دبانے کا بھی شوق تھا۔ اشارہ کرو اور وہ تیار۔ البتہ یہ کام اس سے کوئی کم ہی کرواتا تھا۔ کیونکہ اس کا ہاتھ کیا تھا۔ مستری کی پکڑ تھی۔ جس سے وہ اچھے بھلے آدمی کے نٹ بولٹ کس دیتی تھی۔ اس کے بازوؤں کی گرفت نہ صرف مردانہ بلکہ پہلوانہ تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ آدمی کو نہیں دبا رہی بلکہ بیڈ کور نچوڑ رہی ہے۔ سنت رام تو اس کے دھوبی پٹڑے سے بہت گھبراتا تھا۔ دھوبن ـــــ ہاں، سنت رام نے اس کا یہ نام اس

لئے بھی رکھا تھا کہ بچپن میں اس نے سیر بین میں بارہ من کی دھوبن دیکھی تھی۔ جو نیم برہنہ حالت میں پہلو پہ لیٹے، ہاتھ میں مور کے پروں والا پنکھا لیٹے ایک بھرپور عورت معلوم ہوتی تھی۔ سیر بین والا اپنا ڈبے پہ گھنگھرو بجاتا ہوا گلی میں آتا تھا اور آواز دیتا تھا۔ "پیرس کی رات دیکھو، اپنی بارات دیکھو،" اور پھر بٹون بدل کر، "دھوبن دیکھو بارہ من کی، گوری چٹی آہا ہن کی۔ آہا!"
اور سب بچے ماؤں سے ایک ایک پیسہ لا کر اس جادو کے بکس والے کے ہاتھ میں دیتے ہوئے اپنا اپنا چہرہ اور آنکھیں سیر بین میں ٹھونس لیتے تھے اور نظاروں سے پورا پورا لطف اٹھاتے تھے۔ پیرس، بارات، سفید ریچھ، سرکس کے جوکر کے بعد جب دھوبن آتی تھی تو بچوں کو کچھ پتا نہ چلتا تھا۔ وہ سوچتے۔ دھوبن کیوں اس بکس میں قید کر رکھی ہے؟ مہینہ پہلے بھی وہ ایسے ہی لیٹی ہوتی تھی اور آج بھی لیٹی ہوئی ہے۔ ایک پہلو پہ لیٹے لیٹے کیا وہ تھک نہیں جاتی؟ دھوبن ایک نامحسوس طریقے سے بچوں کو اچھی لگتی تھی۔ وہ دماغ میں گھس جاتی تھی اور کہیں پندرہ بیس برس کے بعد باہر نکلتی۔
ساتھ کے کمرے میں لاڈو، سنت رام کی شادی شدہ لڑکی جو ایک روز پہلے سسرال سے آئی تھی، سو رہی تھی۔ کچھ ایسی

بے خبری میں جیسے اس کا کوئی میاں ہی نہ ہو۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا۔ کیوں کہ رات کے پہلے پہر کمینے بابی، اس کے بچے نے اسے سونے ہی نہ دیا تھا، اور جب اسے نیند آئی تو سانس لینے کے لئے زیادہ ہوا کی ضرورت پڑی۔ لاڈو جیسے شادی سے چھ برس پہلے تھی، ویسے ہی اب بھی بولتی۔ بات کرنے میں منہ سے پانی کی پھوار سننے والے پر پڑتی تھی۔ جیسے وہ روٹھتی ویسے ہی من جاتی

سنت رام اور دھوبن کو یہی فکر تھی، یہ آلی بھولی بیٹی ہماری بسے گی کیسے؟ اسے کوئی "مشکل پسند" میاں مل گیا تو مصیبت ہوگی۔" لیکن اسے میاں جو ملا تو اس نے کوئی شرط ہی نہ پیش کی اور نہ اب پیش کرنے کا کوئی ارادہ رکھتا تھا۔ ادھر اس گھر میں ماں باپ کی ناچاقی، ادھر لاڈو کی سسرال میں والدین کی کثرت محبت یا ایسے ہی دنیا کے ڈر نے مل ملا کر دونوں میاں بیوی کو ایک مضبوط رشتے میں باندھ رکھا تھا۔ بہادر دونوں اتنے تھے کہ گھر میں چوہا نکل آئے تو یہ چیختے چلاتے ہوئے ایک دوسرے کی پناہ ڈھونڈنے لگتے تھے۔ لیکن یہ ڈر اولاد تک منتقل ہو رہا تھا۔ لاڈو کے ساتھ اس کا منا بابی سویا ہوا تھا، ماں کے گلے میں بانہہ ڈال کر جب ذرا نیند کھلتی تو اس کے کان مسلنے لگتا۔

سنت رام نے جب بھی محبت کے جذبے سے معمور ہو کر دو ہتے کو ساتھ سلا دیا تو تھوڑی ہی دیر میں گھبرا کر اسے اُٹھاتے ہوئے پھر اس کی ماں کے ساتھ ڈال دیا۔ سوتے میں بانہہ گلے میں ڈالنے کی بات اتنی نہ تھی، البتہ جب وہ اپنے لجلجے ہاتھوں سے کان مسلنے لگتا تو عجیب سی گدگدی ہوتی اور کبھی یوں معلوم ہونے لگتا، جیسے کوئی کنکول کان میں گھس رہی ہے۔

چھوٹے دو بچے لڑکا اور لڑکی، اپنے ماموں کے ہاں گڑگانواں گئے ہوئے تھے۔ ان کے بستر خالی پڑے ہوئے بے کاری کے عالم میں چھت کو تکا کرتے۔ بڑا، پال، یہیں تھا، جس کے خراٹے سُنائی دے رہے تھے وہ دیکھتے دیکھتے بڑا ہو گیا تھا اور سنت رام کے تسلّط سے نکل گیا تھا۔ سنت رام نے اپنے بیٹے پال کے سلسلے میں اپنی زندگی کا آخری چانٹا کوئی چھ برس پہلے مارا تھا جو اب تک گھس چکا تھا۔ اب تو وہ اس سے ڈرنے لگا تھا۔ آج بھی پال حسبِ معمول رات کے دو بجے آیا تھا۔ ڈپلومیٹ کے دو چار پیگ لگا کر وہسکی کی اصلی مہک تو گھر کے لوگوں نے نیند میں گزار دی تھی، لیکن اب بھی اس کے اُلٹے سانس میں سے بو آ رہی تھی۔

پال چھبیس ستائیس برس کا ایک دُبلا پتلا نوجوان تھا۔ اندر ہی اندر کڑھتے، کھولتے رہنے سے اس کے بدن پر بوٹی نہ آئی تھی۔ اس کے باوجود چہرے کی بناوٹ اور مونچھوں کی ہلکی سی تحریر کے ساتھ وہ مرد کے طور پر قابل قبول تھا۔ عورتیں اسے بہت پسند کرتی تھیں۔ کیونکہ وہ ان کے بچوں کو بہت پسند کرتا تھا۔

کردار کے اعتبار سے پال اُمنگ بھرا تھا اور جاہ طلب اس میں انا بے پناہ تھی —— یہ انا جس کی وجہ سے اس کی ناک کے نتھنے پھٹے جاتے تھے اور وہ بڑے زوردار طریقے سے اپنے آپ کو پال آنند کے نام سے متعارف کراتا تھا جیسے وہ کوئی روایت ہو۔ یہ روایت اس نے کہاں سے پائی تھی؟ اپنے باپ سنت رام آنند ہی سے نا جو ایک بہت بڑی ایڈورٹائزنگ ایجنسی کا مالک تھا اور جس نے اپنے بیٹے کو شہزادے کی طرح سے پالا تھا؟ اس کی ماں، دھوبن، کی چوری سے رقمیں دی تھیں اور اس عمل میں اپنی بیوی سے اپنے تعلقات خراب کر لیے تھے۔ پھر اس نے پال کو عافیت کی چھت دی تھی —— ایک ایسے مکان کی چھت جس میں تین بیڈ روم تھے اور ایک شان دار ڈرائنگ روم جس میں استادوں کی پینٹنگز تھیں۔ پھر دن میں دو دو بار بدلنے

کسے لئے کپڑے۔ یہ سب اپنے باپ سے لے کر وہ کیوں اسے بھی بھول گیا تھا؟ صرف یہی نہیں، اس سے نفرت کرنے لگا تھا اور یوں پاس سے گزر جاتا تھا جیسے وہ اس کا باپ نہیں کوئی اور ہو۔ اگر حکومت نے کوئی نیا قانون پاس کر لیا جس سے کمپنی فیل ہوگئی تو اس میں سنت رام کا کیا قصور؟ زندگی میں نفع ہوتا ہے اور نقصان بھی۔ یہ کیا مطلب کہ نفعے کے وقت تو سب شریک ہو جائیں اور نقصان کے وقت نہ صرف الگ ہو بیٹھیں بلکہ گالیاں بھی دیں؟ لیکن اس میں پال کا زیادہ قصور نہ تھا۔ وہ آج کل کے زمانے کا لڑکا تھا اور صرف اس کی عزت کر سکتا جس کے پاس پیسہ ہو یا اس کے ڈھیر سارے پیسے بنانے بلڈنگیں کھڑی کرنے اور امپالہ کار خریدنے کا امکان ہو۔ ایک بار سنت رام کے سوال پر پال نے یہ بات کہہ بھی دی۔ جس سے بوڑھے کو بہت ٹھیس لگی۔ اس کے اندر کیا کچھ ٹوٹ گیا، اسے اس کا خود بھی اندازہ نہ تھا۔ اس کا کتنا جی چاہا کہ وہ کہیں چوری یاری کر سکے ڈاکہ ڈال یا بینک ہولڈاپ کر کے لاکھ روپیہ بنائے اور اسے بیٹے کے پاؤں میں پھینک کر اس کی اور اس کی ماں کی نظروں میں اپنی کھوئی ہوئی توقیر پھر سے حاصل کر سکے جب

خسارہ ہوا تو دھوبن یا لاڈو یا پال میں سے کسی نے اتنا بھی تو نہ کہا اے جی یا پیا، کوئی بات نہیں، ایسا ہو جاتا ہے۔ آپ جی میلا کیوں کرتے ہیں؟ جیسے کھویا ہے۔ ویسے ہی پا بھی لیا جائے گا۔ جو پیسہ بنانے نکلتے ہیں کھو بھی دیتے ہیں اور یہ ضروری نہیں کہ ہر نقصان اٹھانے والا بے وقوف ہوتا ہے یہ تو وہی بات ہوئی۔ جیسے ہر پیسہ بنانے والا عقل مند ہوتا ہے۔ کیوں سب نے اسے بوڑھا اور سٹھیایا ہوا سمجھ لیا اور بیسیوں بار اس کی طرف دیکھے بغیر پاس سے گزر گئے تھے اور اسے یہ سمجھنے پر مجبور کر دیا تھا کہ وہ اس دنیا میں اکیلا ہے۔ اس کا تو یہی مطلب ہوا نا کہ اگر پھر سے اس کی مالی حالت اچھی ہو جائے تو وہ ان گزری ہوئی سب باتوں کو دل میں رکھ کر ایک ہنٹر ہاتھ میں پکڑے اور کسی بھی غنایت سے پہلے بیوی اور بچوں کو مار مار کر نیلا کر دے۔ نہیں، یہ شوہر اور باپ کا تو رویہ نہیں، لیکن یہ کیوں سمجھ لیا جائے کہ باپ کا کردار پیار دینا ہی ہے، لینا نہیں، گویا اسے پیار کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ پیار کی ضرورت کسے نہیں ہوتی؟ ایک سال کے بچے کو ہوتی ہے نو سو سال کے بوڑھے کو بھی اور نوا ورا پنے کتے جمی کو بھی ہوتی ہے جو اس وقت کہیں اپنے ڈربے میں پڑا سو رہا ہے اور یہ بچ

بیچ میں کہیں سے کوئی آواز آنے پر بھونک اُٹھتا ہے۔ کہیں پیار کی نظریں اس کی نظروں سے ملتی ہیں تو ایک پیغام اس کے دماغ سے دم تک چلا جاتا ہے جو نہ صرف خود بے تحاشا ہلتی ہے بلکہ سارے بدن کو بھی ہلا ڈالتی ہے۔ جس دن اسے کوئی ایسی نظروں سے نہ دیکھے وہ کھانا چھوڑ دیتا ہے گویا کہہ رہا ہو، میں بھوکا رہ سکتا ہوں لیکن پیار کے بغیر نہیں رہ سکتا اور یہاں دھوبن، لاڈو، پال نے اسے جمی کے برابر بھی نہ سمجھا تھا۔

شاید یہ سب اس لئے تھا کہ سنت رام نے زندگی میں صرف دینا ہی سیکھا تھا اور اب یہ اس کی عادت ہو گئی تھی۔ وہ جب دیتا تھا تو جیتا تھا، لینے میں اس کی روحانی موت واقع ہو جاتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا اسے کاروبار میں خسارے کا اتنا غم نہیں جتنا اس بات کا ہے کہ وہ اب دے نہیں سکتا اور جب گھر کے لوگ چپکے میں پاس سے گزر جاتے تھے تو وہ ان کی خاموشی کا عجیب الٹا سیدھا مطلب نکالتا تھا وہ نہ جانتا تھا کہ لینے والوں کو بھی عادت پڑ سکتی ہے۔ لینے کی۔ مگر اس سلسلے میں سنت رام بہت سفاک واقع ہوا تھا اس نے

کتنی بار اُدھار لے کر بھی بیوی بچوں کو تحفے دیئے جو انہوں نے لے کر رکھ لئے اور بے شعوری کی کھڑکیوں میں سے باہر جھانکنے لگے۔ کسی نے شکریے کا ایک لفظ بھی تو نہ کہا اور نہ تشکر کی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ سب نے کتنے کمینے اور بزدلانہ طریقے سے اپنی محبت روک لی تھی یا شاید سنت رام کو اپنے گھاٹے کا اس قدر احساس ہو گیا تھا کہ گھر کے لوگوں کی نگاہوں میں اسے اپنے لئے تحقیر کے سوا اور کچھ دکھائی ہی نہ دیتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب وہ اس نفرت اور تحقیر ہی کو پسند کرنے لگا ہے اور اس وقت تک خوش نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ وہ رحم طلب نظروں سے کسی کی طرف نہ دیکھ سکے۔

دھوبن کی چوبیس گھنٹے کی نیگنگ اور نصیحتوں کی سنت رام کو اتنی پروا نہ تھی۔ کیوں کہ وہ ان پڑھ اور بد زبان ہونے کے باوجود محنتی بہت تھی اور اپنی صفائی پسند طبیعت سے بہت سی چیزوں کی تلافی کر لیتی تھی لیکن ایک رات بڈھے پیار کے لمحوں میں اس نے ہونٹ چرا لئے کیوں کہ سنت رام کے منہ سے سگریٹ کی بو تھی یا شاید دھوبن بوڑھی ہو گئی تھی اور ٹھنڈی اور خشک کیوں کہ یہ جوانی اور اس کی گرمی ہی ہے۔ جس میں بُو اڑ جاتی ہے

اور روئے زمین کی سب خوشبوؤں پر چھا جاتی ہے لیکن اگر دھوبن ٹھنڈی اور خشک اور بوڑھی ہو گئی تھی تو وہ تو خود بھی جوان نہ رہا تھا کیوں کہ اسے اس عمر میں ہونٹوں کی طلب تھی۔ بوڑھے اور بے کیف ہونٹوں کی جن میں رس نام کو نہ تھا ان پر تو صرف جلی کٹی تھیں اور کوسنے جن کے سوا اور کچھ آ ہی نہ سکتا تھا۔ دھوبن، سیدھی سادی اور نادان عورت تو یہ بھی نہ جانتی تھی کہ جب ہونٹ چرا لیے جائیں تو مرد پر کیا بیت جاتی ہے؟ سنت رام انہی کی تلاش میں رُل کر ان ہونٹوں پر اپنے ہونٹ جا رکھتے ہیں جن پر سوائے نجاست کے اور کچھ نہیں ہوتا۔

یا شاید دھوبن، سبز بین کی دھوبن پر، "جیف پار" چلا آیا تھا اور اس نے پہلو بدل لیا تھا اور اپنی سیج سے اٹھ کر مور پنکھ کو ہاتھ سے پھینکتے ہوئے دیکھنے والوں کی طرف سے منہ موڑ کر بیٹھ گئی تھی نہ وہ جادو کے ڈبے والا رہا تھا اور نہ وہ معصوم دیکھنے والے یا خود سنت رام پر وہ وقت چلا آیا تھا جب کہ جوانی ایک بار پھر عود کر آتی ہے اور آدمی کئی بار بدنامی سے بال بال بچتا ہے پہلے کی سی طاقت کے ساتھ

شعور اور تجربہ بھی شامل ہو جاتے ہیں اور ایک پختگی اور رسیدگی پا جانے سے انسان خود بھی اپنے آپ میں تعفن پیدا کر لیتا ہے۔ اور تھوڑے پانی والے جوہڑ کی کیچ میں بھینس کی طرح سے لوٹنے لگتا ہے۔ یا غالباً اس کی وجہ بھی وہی گھاٹا تھی جو سنت رام نے اپنے کاروبار میں کھایا تھا اور مالی طور پر اپنے آپ کو غیر محفوظ پانے کا احساس محبت میں غیر محفوظ ہونے کے احساس میں بدل کر رہ گیا تھا۔

لاڈو کی تو خیر کوئی بات بھی نہ تھی وہ تو بیاہی بری گئی اور اپنے گھر جا بسی۔ وہ تو اب بابل کے آنگن کی چڑیا تھی۔ جو کہیں پڑے ہوئے دانوں کو چنتی ہوئی اڑ جاتی تھی۔ لیکن پال تو یہیں تھا اور اُسے یہیں رہنا تھا اسی گھر میں، اسی چھت کے تلے جہاں اسے بہو کو لانا اور لبسانا تھا۔ کہیں اور گھر لے لینے سے تو باپ کے گھر کی چھت نہیں بدلتی۔ وہ کیوں چند باتوں کو نہیں سمجھتا، اور یا سمجھنا ہی نہیں چاہتا؟ کیوں اس کے پاس اپنے بہن بھائیوں، اپنے ماں باپ کے لئے چند منٹ بھی نہ تھے امریکن فرم میں اگزیکٹو ہو جانے سے کیا وہ کوئی خدا ہو گیا تھا؟ کیوں وہ اس فرم کے ذریعے سے پرائیویٹ کنٹریکٹ لینے اور

یوں پیسہ پیدا کرنے میں کوئی عار نہ سمجھتا تھا؟ وہ کبھی تو باپ سے بات کرتا جو اس سے پیسے تو نہ مانگتا تھا وہ تو فقط یہی چاہتا تھا کہ اس کا بیٹا اس کے پاس بیٹھے۔ دو تین جسم اکٹھے ہوں جو ایک دوسرے سے نکلے ہیں۔ بدن، صرف بدن کا لمس ہو یہ نہ بھی ہو تو آنکھیں ملیں جو باپ ہی پر نہیں آبا و اجداد پر گئی ہیں پاس بیٹھ کر آج کی نئی تعلیم کی باتیں کرے۔ جس سے پرانے بہت پڑھے لکھے آدمی بھی پیچھے رہ گئے ہیں۔ کچھ ان کی دنیا کا پتا چلے، کچھ اپنی دنیا انہیں دکھائی جا سکے۔ اس سے سیکھیں اور اسے بتا بھی سکیں کہ صرف تعلیم ہی بس نہیں، تجربہ بھی ضروری ہے اور چند حالات میں جیمز بانڈ کے علم سے بہت اوپر ہوتا ہے۔ وہ کبھی کچھ تو مانگے، اور کچھ نہیں تو مشورہ ہی سہی۔ کیوں وہ ایکا ایکی اس قدر خود مختار اور بے نیاز ہو گیا تھا؟ یہ دلیل کافی نہیں کہ وہ بڑا ہو کر اب ماں باپ پر کسی قسم کا بوجھ نہیں بننا چاہتا۔ بوجھ ہی کی بات ہے تو وہ اب بھی بوجھ ہے۔ کہیں وہ کپڑے اُتار کر دھوبن کے سامنے پھینک جاتا ہے اور چونکہ گھر میں کچھ پیسے دیتا ہے اس لئے ماں ماں نہیں رہی۔ سچ مچ کی دھوبن ہو گئی۔ گھر میں بیسیوں مہمان آتے جاتے ہیں، انہیں ایئر پورٹ سے لینا یا گاڑی

پر چھوڑنے جانا صرف ماں باپ کا ہی فرض ہے؟ اور کچھ نہیں تو لاڈو ہی کو ملنے، لینے چلا جائے وہ اپنی بیٹی ہے تو اس کی بھی بہن ہے اگر پال یہ سب حرکتیں ناسمجھی کے عالم میں کرتا تو کوئی بات نہ تھی، لیکن وہ تو بلا کا ذہین تھا اور ایک پل میں معاملے کی تہہ تک پہنچ جاتا تھا۔ چار سال قبل جب ایک نہایت امیر ماں باپ کی اکلوتی بیٹی سے اس کا رشتہ ہونے کی بات چلی تو کھٹ سے اس نے انکار کر دیا اور بولا "دس سال مجھے آپ کے چکر سے نکلنے میں لگے ہیں، پپا! آپ چاہتے ہیں میں اور سال ایک امیر آدمی کی اکلوتی بیٹی کے چکر سے نکلنے میں گزار دوں؟"

سنت رام اس بیٹے کی بات کو سن کر چکیت ہو گیا تھا۔ اسے اس بات کا گورو بھی ہوا کہ وہ میرا بیٹا ہونے کے ناطے سے بہت خود دار واقع ہوا ہے اور افسوس بھی۔ افسوس اس لئے کہ باپ کے چکر سے نکلنے کا کیا مطلب؟ کیا بیٹا باپ کے چکر سے نکل سکتا ہے یا باپ بیٹے کے چکر سے؟ کیا وہ ایک دوسرے سے کبھی الگ نہ ہو سکنے والا حصہ نہیں؟ کیا براعظموں کا فاصلہ ہونے پر بھی وہ ایک دوسرے سے دور ہوتے ہیں؟ آخر کون سا وہ اندھا ہے جسے وہ ڈور دکھائی نہیں دیتی جو باپ بیٹے

سے وقتی طور پر یا ہمیشہ کے لئے جدا ہوتے ہوئے اپنے پیچھے چھوڑنا اور چھوڑنا ہی چلا جاتا ہے؟ بیٹا چاہے باپ کے جانے کے بعد یہی کہے کہ میرا باپ نالائق آدمی تھا، ہزاروں کا قرض مجھ پہ چھوڑ کر چلتا بنا۔ اس پر بھی تعلق تو رہنا ہی ہے نا؟ نالائق باپ اور لائق بیٹے کا تعلق۔ میں تو مر ہی نہیں سکتا جب تک اپنی اولاد کے لئے کچھ چھوڑ کر نہ جاؤں۔ ایسا ہوا تو ان کی ماں، دھوبن تو مجھے وہاں خدا کے گھر تک نہ چھوڑے گی۔ اور وہیں روح تک کا تولیہ نچوڑ ڈالے گی لیکن میرے باپ نے میرے لئے کیا چھوڑا تھا؟ اس پر بھی ان کی عزت میرے دل میں کبھی کم نہیں ہوتی گیا۔ پیشہ اور جائیداد چھوڑنے ہی سے کوئی باپ کہلانے کا مستحق ہوتا ہے؟ یہ بات تو اعداد و شمار ہی سے غلط ہے۔ ایک باپ مقروض مرتا ہے۔ جبھی دوسرا جائیداد بنا سکتا ہے نا؟ خیر، میرا تو ابھی تعلق روڈ پر ایک بنگلہ ہے کیا ہوا گھاٹے کے بعد اس پر تھوڑا پیسہ لے لیا۔ کیا میں اتنا ہی گیا گزرا ہوں کہ مرنے سے پہلے اس کا رہن بھی نہ چھڑا سکوں۔ پھر گاؤں، جگدل، میں زمین ہے دو سو بیگھے، جس میں سے کچھ بڑوں کی ہے اور کچھ میں نے اپنے پیسے سے بنائی ہے

کیا یہ میری ہمت نہیں کہ اتنی مصیبت آپڑنے پر میں نے اس کا ایک ایچ نہیں بیچا۔ میں نے اس لیئے نہیں بیچا کہ میرے پرکھوں کی روح کو تکلیف نہ ہو اور میرے بیٹے مجھے کوسنے نہ دیں۔ پھر بیمہ ہے۔ بہت ٹوٹ آئی تو خودکشی کر کے بیوی کو پیسہ دلوا سکتا ہوں۔

جبھی سنت رام کو اپنا باپ یاد آیا اور اس کی موت کا وقت جس میں صدمے کی انتہا تھی اور اس کے بیچ ایک عجیب سی پراسرار خوشی بھی کہ اب جو بھی اچھا برا کریں گے اپنا کریں گے، اور پال کے سلسلے میں اس بات نے سنت رام کو ایک عجیب طریقے سے مکت کر دیا۔ آخر کون سا بیٹا ہے جو اپنے دماغ کے کسی کونے میں اپنے باپ کی موت کی خواہش نہ لیے بیٹھا ہو؟

سنت رام کو ایک عجیب سے سکون کا احساس ہوا۔ ساتھ کے کمرے میں آکر اس نے زیرو پاور والا بلب جلایا اور اس کی مدھم سی روشنی میں لاڈو، اس کے بچے بابی اور پھر پال کا چہرہ دیکھا اور کچھ دیر کھڑا دیکھتا رہا۔ وہ اپنے بیٹے میں جی رہا تھا اور پھر اپنے پوتے، پڑپوتے ہیں۔

جبھی سنت رام کو ایک سگریٹ کی طلب ہوئی۔

ارے یار! سگریٹ بھی کیا چیز ہے۔ جس نے بھی اسے ایجاد کیا، حد کر دی۔ کیسا ایک ننھا سا رفیق زندگی کا جو آپ کے تنہا لمحوں میں کسی دوسرے کے موجود ہونے کا احساس دلاتا رہتا ہے اور اس کے دم سے آپ کبھی اکیلا محسوس نہیں کرتے، بلکہ وہ خود زندگی ہے۔ جس کا ایک کنارہ زندگی ہی کی طرح سے دھیرے دھیرے سلگتا اور دوسرا موت کے منہ میں یا منہ کی موت میں پڑا ہوتا ہے وہ آپ کے ہر سانس کے ساتھ جیتا اور مرتا ہوا خود راکھ ہو جاتا ہے لیکن آپ کے بکھرے ہوئے خیالوں کو ایک نقطے پر سمیٹ لاتا ہے۔ آپ چند ایسے راز سمجھ چکے ہوتے ہیں۔ جن کے بعد اور کچھ سمجھنے کی ضرورت ہی نہیں رہ جاتی لوگ کہتے ہیں اس سے کینسر ہو جاتا ہے۔ ہُوا کرے۔ جو لوگ سگریٹ نہیں پیتے وہ کون سی خضر کی حیات جیتے ہیں؟ دنیا کے ہر بشر کو آخر کوئی نہ کوئی بہانہ تو موت کو دینا ہے۔ سگریٹ کا بہانہ کیوں نہ ہو

رات جب سنت رام گھر لوٹا تو سگریٹ لانا بھول گیا تھا اور اس وقت، ساڑھے چار بجے، دکانیں بند تھیں اور سنت رام کی طلب کھلی، جو کھلتی ہی جا رہی تھی۔ سامنے بیٹھے پال، کے سگریٹوں کا پیکٹ پڑا تھا جس کے اوپر ماچس رکھی تھی۔ پال

شہزادہ ہونے کے کارن اسٹیٹ ایکسپریس سے ادھر سگریٹ ہی نہ پیتا تھا۔ حالانکہ اس کے باپ، سنت رام کو چار مینار سے لے کر قینچی اور گولڈ فلیک تک سب چلتے تھے۔ اسٹیٹ ایکسپریس پی لوں؟ کیا ضرورت ہے؟ کیا میں چھ، ساڑھے چھ بجے تک انتظار نہیں کر سکتا۔ جب کہ پان بیڑی کی دکانیں کھلنے لگتی ہیں؟ لیکن اگر انتظار کرنے دے تو پھر وہ سگریٹ نہیں دودھ کا گلاس ہوا سنت رام کا ہاتھ پیکیٹ کی طرف لپک گیا۔ زیرو پاور کے بلب کی روشنی میں اس نے دیکھا۔ پیکیٹ میں صرف دو ہی سگریٹ تھے۔ ایک تو پال کو باتھ روم کے لئے چاہیئے ہی تھا اور دوسرا؟ کیا پتا ایک سگریٹ سے اس کا کام نہ چلتا ہوا اور دوسرے کی بھی ضرورت محسوس ہو۔ اس وقت نہیں تو شیو کے بعد سہی یا ناشتے کے بعد اس علاقے میں اسٹیٹ ایکسپریس کہاں ملتے تھے جو اُٹھ لینے کے بعد نو دس بجے سے پہلے چوری چپکے رکھ دیئے جائیں، جب کہ پال اُٹھتا تھا۔ رکھ بھی کیسے دیئے جائیں کیونکہ ان سگریٹوں کے لئے کناٹ پیلس جانا اور آنا پڑتا تھا جس کا مطلب تھا آدھا گیلن پٹرول پھونک دینا، ایک سگریٹ کے لینے اس سے اچھا ہے کہ چھ، ساڑھے چھ بجے تک انتظار

کر لیا جائے۔

لیکن صاحب سگریٹ جب بلاتا ہے تو اتنی زور کی آواز دیتا ہے کہ کانوں کے پردے پھٹ جاتے ہیں وہ آواز نہ پینے والوں کو سنائی نہیں دیتی۔ ان کے کان سر میں نہیں ہوتے نا۔ کیوں نہ بھیکو، اپنے نوکر، سے سگریٹ لے لیا جائے؟ وہ تو بیڑی پیتا ہے؟ بیڑی ہی سہی۔ لیکن بھیکو کو اس کی کمبھ کرن کی نیند سے جگانے کا مطلب تو یہ ہوا کہ پورا پہاڑ کھود دو اور پھر اس سے ایک کنکری کی فرمائش کرو، کیونکہ بھیکو ہمیشہ ہڑ بڑا کر، کیا ہوا، کیا ہوا، کہتا ہوا اٹھتا تھا جس سے گھر کے سب لوگ جاگ جاتے تھے۔ اس کمینے کی نیند بدعنوانیوں کی وجہ سے نہ پکتی تھی۔ ارے باہر چوکیدار بھی تو ہے۔ سنت رام نے دروازہ کھول کر جھانکا اور بتیوں کی روشنی میں ادھر ادھر دیکھا، چوکیدار کا کہیں تخم بھی نظر نہ آتا تھا۔ پونے پانچ بجے تھے اور وہ اپنی سمجھ میں پانچ بجا کر اپنی ڈیوٹی پوری کرتے ہوئے کسی چور کے ساتھ جا سویا تھا۔ بیکار ہی ہم لوگ اسے پیسے دیتے تھے۔ کون سا ڈاکہ پڑنے والا تھا جب کہ سامنے پولیس کی چوکی تھی؟ بھیکو، چوکیدار یا چوکی کے کسی

سنتری سے بیڑی مانگنے سے تو یہی اچھا ہے کہ اپنے بیٹے کا اسٹیٹ ایکسپریس سگریٹ پیا جائے۔ اسے برا تو لگے گا مگر جو ہوگا دیکھا جائے گا۔

چنانچہ سنت رام نے پیکٹ اٹھایا اور ایک سگریٹ نکال کر سلگا یا۔ ایک ہی کش سے سنت رام کا اضطرار آدھا رہ گیا تھا۔ دوسرے کش سے ایک چوتھائی۔ اس حساب سے تو تیسرے چوتھے کش سے پوری تسلی ہو جانی چاہیئے تھی، لیکن سگریٹ کا بھی عجیب حساب کتاب ہوتا ہے، جیسے اضطرار کا اپنا لاجک۔ چوتھے کش کے بعد اضطرار کے کم ہونے کی رفتار گھٹ جاتی ہے اور سگریٹ کے جلنے کی زیادہ۔ بہرحال مزہ بہت آیا اسٹیٹ ایکسپریس اتنا اسٹرانگ سگریٹ تو نہیں جتنا چار مینار، مگر اچھا ہے۔

پورا سگریٹ پی چکنے کے بعد سنت رام کو محسوس ہوا کہ اس نے برا کیا۔ کیا وہ تھوڑی دیر کے لئے ایک سگریٹ کے بغیر نہ رہ سکتا تھا؟ نہیں، جوانی میں آدمی اپنے حواس پر قابو رکھ سکتا ہے، بڑھاپے میں نہیں، آخر بیٹے کا سگریٹ پیا ہے نا! مجھے خوش ہونا چاہیئے اور اگر وہ میرا بیٹا ہے تو اسے بھی۔ کیسا

مزہ آیا! چھوٹی چوری میں بہت مزہ آتا ہے۔ جبھی بابی کے بڑبڑانے کی آواز آئی: "ماروں گا۔ میں تم کو ماروں گا۔" وہ خواب میں کسی سے لڑ رہا تھا۔ لاڈو نے آدھے سوئے آدھے جاگے عالم میں اسے تھپکنا شروع کر دیا: "سو جا بابی، سو جا۔" بابی سو گیا اور وہ بھی سو گئی۔ پال کو کچھ پتا نہ تھا۔ اس کے خراٹے تو جا چکے تھے البتہ ناک میں کوئی چیز اڑے ہونے کے کارن سیٹی سی بج رہی تھی۔ جبھی اندر سے دھوبن کی آواز آئی:

"سگریٹ پی رہے ہو؟"

"ہاں۔" سنت رام نے وہیں سے کہا۔

جس کے جواب میں وہ بولی: "صبح صبح ہی شروع ہو جاتے ہو، دن تو چڑھنے دو۔ یوں کلیجہ جلانے سے بیمار ہو گے کہ نہیں ہو گے؟"

سنت رام نے دل ہی دل میں کہا۔ میری بیماری کی جیسے بہت پروا ہے۔ یہ گھر کے لوگ جب پروا کرنی ہوتی ہے تو نہیں کرتے اور جب نہیں کرنی ہوتی تو کرنے لگتے ہیں۔ اس نے اندر کے کمرے کی طرف منہ کر کے صرف اتنا کہا: "تم سو جاؤ، ابھی سوا پانچ ہوئے ہیں۔"

دھوبن کی آواز اس کی انگڑائی میں سے چھن کر آئی: "نہیں مجھے ہیٹر لگانا، چائے گرم کرنا ہے۔ بہت کپڑوں کا ڈھیر ہے۔"

جبھی دھوبن کے اٹھنے کی آواز آئی۔ ہاں صاحب، جب، عورتیں اٹھتی ہیں تو وہ اس بات کا دکھ دکھاوا نہیں کرتیں کہ ان کی کھٹ پٹ سے کوئی ڈسٹرب ہو گا۔ وہ بستر کی چادر کو جھاڑ رہی تھی، جیسے اس پر کہیں ریت آپڑی ہو۔ پھر الماری کی دکیں، سنائی دی اور اس میں سے دودھ کے پیسے نکلے۔ یہی سینڈل کی کھٹ کھٹ برسوں پہلے لگتی اور دماغ میں فتور پیدا کرتی تھی، اب یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ہتھوڑے پڑ رہے ہوں۔

چادر جھاڑتے ہوئے دھوبن کی آواز آئی: "اوف، اوف دماغ جل گیا ہے سگریٹ کی بو سے۔"

"اچھا، اچھا،" سنت رام نے کہا، "تمہیں بو ہی آتی رہتی ہے۔"

دھوبن کو واقعی بہت بو آتی تھی، جو غالباً عمر کا تقاضا تھا جو نئے کمرے میں کوئی سگریٹ پیے اسے وہیں سے پتا چل جاتا تھا۔ ایسے ہی وہسکی، شراب کا، چاہے کسی نے صرف چکھا ہی

ہوا ہو۔ اس کی کنجوسی، اس کے اخلاقی طور پر اچھا ہونے نے گھر کے سب لوگوں کو چور بنا دیا تھا۔ سب بے حال ہو کر علتیں کرتے اور پھر انہیں چھپانے کی کوشش کرتے تھے لیکن دھوبن سے کوئی کچھ چھپا نہ سکتا تھا۔ کتنی بار ایسا ہوا کہ آپ نے باہر نکل کر، بالکنی پر جا کر سگریٹ سلگایا لیکن جب مڑ کر دیکھا تو دھوبن موجود، جس سے سگریٹ کا مزہ ہی جاتا رہا۔ اس کی اس روک ٹوک نے پال میں بغاوت کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ اب وہ کھلے بندوں سگریٹ پیتا تھا، بلکہ اس نے اسکاچ کی ایک بوتل گھر ہی میں لا رکھی تھی۔ باہر سے آنے پر جب اسے محسوس ہوتا کہ شراب کم پڑی ہے تو ایک آدھ پیگ گھر ہی میں منگا لیتا۔ ماں سے اس کی کئی بار لڑائی ہوئی تھی۔ دھوبن آخر اس سے ہار گئی تھی۔ اس نے کہا بھی تو اتنا۔ "میرا کیا ہے، جو آئے گی روتے گی۔"

سگریٹ! دراصل مرد اور عورت کے منہ کی بو کو ایک ہونا چاہیے ورنہ سب تباہ ہو جاتا ہے۔ اسی تباہی کے کارن سنت رام نے اپنی ٹائپسٹ، ڈولی، کو پہلے سگریٹ پلا لیا تھا۔ پال اٹھے گا تو کیا کہے گا؟ یوں ایک سگریٹ پی لینے میں تو

کوئی بات نہیں لیکن کسی عمل، کسی ذائقے کا تکمیل نہ پانا برا ہے۔ یہ ایسے ہی ہے۔ جیسے دو محبت کرنے والوں میں کوئی تیسرا آجائے پھر پال کٹی باتوں میں کس قدر کمینہ ہے۔ ایک بار اس کا جوتا پہن لیا تو وہ کتنا جزبز ہوا تھا۔ اس نے جوتے کو لے کر پھینک ہی دیا اور کہنے لگا: "میرے اور پپا کے پیر ایک ہیں کیا؟ اب یہ کھل گیا ہے اور میرے کام کا نہیں۔" سنت رام کو بہت دکھ ہوا۔ ایک بار بیٹے کا جوتا پہن لیا تو کیا ہو گیا؟ بیسیوں بار اس نے میرا چپل پہنا ہے، میں نے تو کچھ نہیں کہا۔ اُلٹی مجھے خوشی ہوئی اس احساس کے ساتھ میرے بیٹے نے میرا جوتا پہنا ہے، اور بڑوں کا یہ کہنا بھی دماغ میں آیا: جب باپ کا جوتا بیٹے کے برابر آجائے تو پھر اسے کچھ نہیں کہتے۔ چنانچہ جب سے میں نے سب کہنا سننا چھوڑ دیا۔ نہیں، ایک بار اس نے کسی سمگلر سے امریکن جرکن خریدی تھی جو مجھے بہت اچھی لگی پال کو بھی اچھی لگی تھی جبھی تو اس نے خریدی، لیکن میں ہمیشہ کی طرح اپنے بڑھاپے کے کارن اسے پہننے کے جذبے کو روک نہ سکا، چنانچہ میں نے پہن لی۔ اس کے رنگ بڑے شوخ و تنگ تھے اور مجھے اسے پہننے میں بہت مزہ آیا۔ لیکن پہلے تو دھوبن

نے میرے مرنے کو کرکرا کیا۔ وہ مجھے دیکھ کر ہنس دی۔

"کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

وہ اندر ہی اندر اپنی ہنسی دباتے ہوئے بولی: "کچھ نہیں" اور پھر وہ بھی نہ سکی اور کہنے لگی: "کیسے گھوم رہے ہو، جیسے دیسی مرغا مرغی کے ارد گرد گھومتا ہے۔"

یہ جذبات کا دھوبی پٹڑا تھا، خیر۔

لیکن رہی سہی کسر پال نے پوری کر دی، میں نے اپنا شوق پورا کرنے کے بعد اس جرکن کو بڑی احتیاط سے وارڈ روب میں ٹانگ دیا، لیکن صبح ہی تو پال جرکن کو میرے پاس لے آیا اور بولا: "پپا، آپ ہی اسے پہن لیجئے۔"

میں نے مجرمانہ انداز سے کہا: "کیوں، تم کیوں نہیں پہنتے؟"

"یہ میرے کام کا نہیں رہا۔" وہ بولا، "دیکھنے نہیں آپ کا پیٹ بڑا ہے، اس کے پہننے سے الاسٹک چلا گیا ہے اس کا ۔۔۔"

مجھے بے حد غصہ آیا اور میں اس پر برس پڑا، میں نے کہا: "میں تمہارا باپ ہوں، جرکن پہن لی اور تمہارا نقصان کر دیا؟ تم نے سینکڑوں نہیں ہزاروں بار میرا نقصان کیا ہے، میں نے

کبھی تمہیں کچھ نہیں کہا ہے، اُلٹا خوش ہوا ہوں۔ چلو یوں کہہ لو کہ باہر سے ناراضی کا ثبوت دیا لیکن اندر سے میں کتنا خوش تھا۔ تم سینکڑوں بار میری قمیض، میرا جوتا پہن گئے ہو، میں نے بھی کہا: "میرا بیٹا میرے کپڑے پہنتا ہے" اور تم نے اسی طرح اس دن دو گھوڑے والی بوسکی کی قمیض میرے منہ پر پڑے ماری، تم نہایت کمینے، نہایت بے شرم آدمی ہو۔"

بجائے اس کے کہ پال کو افسوس ہو، وہ میرے ساتھ دلیل بازی پر اُتر آیا: "آپ پان کھاتے ہیں۔" وہ کہنے لگا، "اور اس کا کوئی نہ کوئی چھینٹا اس پر پڑ جاتا ہے۔ کیا وہ قمیض میرے پہننے کے لائق رہتی ہے؟"

ان دنوں بھی لاڈو یہاں، اپنے مائیکے، آئی ہوئی تھی۔ اس جھگڑے میں وہ بھی پاس آ کھڑی ہوئی اور بول اُٹھی: "پپا بالکل میری طرح ہیں۔"

چھوٹے دونوں بھی، جو اس وقت اپنے ماموں کے ہاں گڑ گانواں گئے ہوئے ہیں، یہیں تھے، چھٹکی بھیکو کی مدد سے بستر کی سلوٹیں نکالتی ہوئی بولی: "ہاں، بات کرتے ہیں تو لاڈو دیدی کی طرح منہ کی ساری پھوار سامنے والے پر چھوڑ دیتے ہیں۔

تماشا اس وقت ہوتا ہے۔ جب کبھی پپا اور لاڈو آپس میں بات کر رہے ہوں تو۔"

لاڈو سن رہی تھی، دوسرے سب سن رہے تھے نہ چاہنے کے باوجود میرے چہرے پر بھی مسکراہٹ چلی آئی تھی۔ بات سنجیدہ بھی تھی اور مضحک بھی۔ میں نے ٹالتے ہوئے کہا بھی تو اتنا: "ہاں آخر لاڈو کا باپ ہوں نا، اسی پر گیا ہوں۔"

اور تو اور چھوٹا، ومن، بھی ہنس رہا تھا۔ سنجیلوں کی طرح پھیپھڑے پیدائشی طور پر کمزور ہونے کے کارن وہ کبھی کھل کے نہ ہنسا۔ "ہی ہی، پان کھاتے ہیں نا پپا!" اس نے کہا۔ "تو قمیض پر سامنے تو لگتا ہے، لیکن پیٹھ پر جانے کیسے لگتا ہے؟"
یہ سب سمجھتے تھے۔ میں پان منہ سے تو کھاتا ہی نہیں، قمیض سے کھاتا ہوں۔ اس پر طرفہ، دھوبن منظر پر چلی آئی۔ میرا خیال تھا کہ ماں ہونے کے ناطے وہ باپ کا پکش لے گی، لیکن صاحب اس نے اُلٹا بیٹے بیٹیوں کی تائید شروع کر دی:

"کیا پوچھتے ہو ان کا؟" وہ بولی، "بالکل بابی ہیں اُوپرے کھانا کھائیں گے تو سالن کرتے پر گرا ہو گا، لکھنے بیٹھیں گے سیاسی۔ میں ان کا کروں کیا؟ پتا تو مجھے چلتا ہے۔ دھوتے دھو

جس کے ہاتھ رہ جاتے ہیں۔ یہ میری قسمت! عمر گزر گئی میری ان کے داغ نکالتے نکالتے۔"

صرف ایک بابی رہ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا بالس تھا جس سے وہ "بڈھا بابا" کو جھنکا رہا تھا۔ "ماروں گا" وہ خلا میں خیالی دشمن کو خطاب کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا۔ جیسے اس کا بڈھا بابا، اس کا خیالی دشمن میں ہوں۔ پھر جمی کے بھونکنے کی آواز آئی، جیسے آپ اتفاقیہ کہہ لیجئے۔ بھیکو بجلی کا بل چکانے چلا گیا تھا۔ ورنہ وہ اپنی مکھی بولی میں کہتا: "ہم میاں بیوی کا جھگڑا میں نہیں پڑ بو۔" اور یہ بات اور بھی میرے خلاف جاتی۔ گھر بھر میرا دشمن ہو گیا تھا ایسا پہلے تو نہ تھا۔ چند برس پہلے جب سے مجھے کاروبار میں گھاٹا پڑا ہے دنیا ہی بدل گئی ہے۔ کسی کو میری بات ہی پسند نہیں، یا شاید میں بوڑھا ہو گیا ہوں اس لئے سب کو بُرا لگتا ہوں۔ مجھے ان کے سامنے سے ٹل جانا چاہیئے، اس دنیا سے ٹل جانا چاہیئے لیکن میں جاؤں تو کہاں جاؤں؟ میں نے اس گھر، ان لوگوں پر اپنی جان بھی وار دی۔ نہ کبھی کلب کا ممبر ہوا، نہ ریس کورس پر گیا۔ یہ تو یہ کوئی پکچر بھی ڈھب سے نہ دیکھی۔ کام، کام اور کام۔ تفریح

کے لئے ایک لمحہ نہیں، اسی لئے میں ذہنی طور پر بیمار ہو گیا ہوں شاید پاگل۔ پاگل نہیں تو سنکی ضرور ہوں۔ کبھی پاگل یا سنکی کو پتا چلا ہے کہ وہ کیا ہے؟ اسے تو صرف دوسرے جانتے ہیں۔ کبھی کبھی ان کی شکلوں سے اپنی شکل کا پتا چلتا ہے۔ نہیں، یہ بات نہیں۔ خدا! کسی کو خسارہ نہ ہو۔ جوانی میں جو ہونا ہے وہ ہو جائے لیکن اس ڈھلتی، آخری عمر میں نہیں، جب کہ مدافعت کی ساری قوتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ بچوں کا فادر امیج گڑبڑ ہو جاتا ہے اور بیوی کا بھی۔

پال آٹھ بجے اُٹھ گیا تھا۔ اسے اُٹھتے دیکھ کر سنت رام سنسنا گیا۔ ڈرنے کی ایک مثال یہ ہے کہ آدمی سامنے یا دل میں کہنے لگے "میں کسی سے ڈرتا ہوں؟" سنت رام پر اچھی طرح سے واضح ہو چکا تھا کہ وہ اپنے بیٹے سے ڈرتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا معاملے کو اس سطح پر لے آئے جس سے بیٹا یہ کہے کہ میں اس گھر میں نہیں رہوں گا۔ پال تو چاہتا تھا ایسا موقع پیدا ہو۔ کوئی سُنے تو ہنسے، بیٹے کا ایک —— صرف ایک سگریٹ پی لینے سے اتنا ڈر اور اتنی ذہنی بک بک۔

چائے سے پہلے پال نے باپ کی طرف دیکھا اور معمول کی

نمسکار کی جس کے جواب میں سنت رام نے سر ہلا دیا اور اپنی نگاہیں نیچی کر لیں۔ وہ چاہتا تھا کہ پال دوسری طرف دیکھے تو وہ اس کی طرف تکے، لیکن پال نے برابر اپنا منہ باپ کی طرف رکھا۔ جس سے گھبرا کر سنت رام نے اپنا چہرہ ہندوستان ٹائمز کے پیچھے چھپا لیا۔ پھر اسے تھوڑا اُٹھا کر دیکھا تو پال شڑک شڑک چائے پی رہا تھا جس کے بعد اس نے کھٹ سے پیالی پرچ میں رکھی، پھر وہ سگریٹ کا پیکٹ تھامے باتھ روم کی طرف نکل گیا۔

اب تک تو سب ٹھیک تھا۔ پال نے پیکٹ کھول کر نہیں دیکھا تھا نا۔ جب وہ باتھ روم جائے گا، تب اسے پتا چلے گا اور سنت رام بیٹے کے باہر آنے اور اس کا چہرہ دیکھنے کے لئے یونہی اِدھر اُدھر ہوتا رہا۔ دھوبن نے کہا: "نہاؤ گے نہیں،" جواب میں جھلاتے ہوئے سنت رام نے جواب دیا: "نہیں ملنے کی پڑی ہے، اب ایک ہی بار نہاؤں گا۔"

دھوبن حیرانی سے سنت رام کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی پھر پھنکار کو معمول کی لایعنی سمجھ کر ناشتے کے دھندے میں مشغول ہو گئی۔

تھوڑی دیر میں پال باتھ روم سے آیا تو اس کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے، ماتھا کچھ اوپر پیچھے ہٹ گیا تھا۔ وہ واش بیسن میں جلدی جلدی اپنے ہاتھ صابن سے دھو رہا تھا۔ اتنی جلدی کیا تھی؟ کیوں وہ جلدی بھاگ جانا چاہتا تھا؟ سامنے اس نے آئینے میں اپنے چہرے کی طرف دیکھا، منہ سے جھاگ چھٹ رہے تھے۔ نہیں، ہاتھ دھوتے ہوتے جھاگ اُڑ کر چہرے پر چلے آئے تھے۔ چونکہ ہاتھ ابھی صابن سے اٹے تھے اس لئے اس نے کرتے کے بازو سے جھاگ پونچھ دیا اور اپنا چہرہ دیکھنے لگا اس کے نتھنے پھول رہے تھے۔ دوسروں کو دیکھ کر نتھنے پھلانا تو سمجھ تھا لیکن اپنے آپ کو دیکھ کر نہیں۔ ہاتھ دھوتے ہوتے پال لوٹا تو دھوبن نے آواز دی: "رات تم پھر پی کر آئے تھے؟"

پال نے کوئی جواب نہ دیا، صرف اتنا کہا: "ہاں، آج پھر پینے والا ہوں۔"

دھوبن تن گئی۔ وہ ایسی دبنے والی تھوڑی ہی تھی۔ اس نے صاف کہہ دیا: "آج پی کر آئے تو میں دروازے میں قدم نہ رکھنے دوں گی۔" جس کے جواب میں پال نے کہا: "آنا کون

جاہتا ہے اس جیل خانے ہیں؟ میں نے پہلے ہی گولف لنکس میں ایک کمرہ دیکھ رکھا ہے۔" پھر دھوبن کی پائیدار آواز آئی: "نکل جاؤ، ابھی نکل جاؤ۔" جس سے سنت رام کی جان نکل گئی۔

"شانتی!" سنت رام نے کڑک کر کہا "کیا بکتی ہو؟ یہ گھر تمہارا ہے؟"

اسی بیچ میں دھوبن نے جواب دیا: "ہاں، میرا ہے۔ جاتا ہے تو جائے۔ تم بھی جانا چاہتے ہو تو جاؤ۔ بھلا ہو تم باپ بیٹوں کا جنھوں نے جینا سکھا دیا۔" اور پھر وہ رونے لگی۔ سنت رام اس بات سے توڈرتا آیا تھا کہ ایسا موقع نہ آئے۔ بیٹے کی بدعنوانیوں کو دیکھ دیکھ کر اندر سے کڑھتا رہتا تھا۔ لیکن باہر سے کچھ نہ کہتا تھا۔ یہ کہنا تو بہت آسان ہوتا ہے: "چلے جاؤ،" مگر "پھر واپس آجاؤ،" کہنا مشکل۔ پال کے باقی کے کام کی رفتار اور بھی تیز ہو گئی۔ وہ جلدی جلدی بٹوبنا رہا تھا اور اپنی ٹھوڑی پہ بے شمار فِط لگا رہا تھا اور خون پونچھ رہا تھا۔ اس نے ماں کو ایسا جواب کیوں دیا؟ وہ ماں کو اُلٹی سیدھی کہتا تو سنت رام کو تکلیف ہوتی تھی اور ماں اُسے کچھ کہتی تو اذیت۔ لیکن ماں بیٹے کا رشتہ زیادہ قدرتی تھا۔ جس میں وہ ایک دوسرے کو سن سُنا کر پھر

ایک ہو جاتے تھے۔ مگر آج پال کا انداز یہی تھا کہ وہ جاتے گا تو پھر نہیں آئے گا۔

"آنا کون چاہتا ہے اس جیل خانے میں؟" اس کا کیا مطلب پال کچھ کہہ نہیں رہا تھا لیکن اندر سے محسوس کر رہا تھا کہ اس گھر میں آنے کا کیا فائدہ جہاں کوئی چیز اپنی نہ رہ سکے، جوتا، جرکن اور نہ سگریٹ، پھر پال جلدی جلدی نہایا اور کپڑے پہنتے ہوتے باپ کے پاس سے گزر گیا، سنت رام نے اسے بلانے کی کوشش کی لیکن اس نے آنا کانی کر دی۔ اخبار بھی اٹھا کر نہ دیکھا اس نے اور اسٹیٹ ایکسپریس کا پیکٹ پوری نفرت سے کھڑکی کے باہر پھینکتا ہوا وہ نکلنے لگا۔ دھوبن تو اس سے لڑ بیٹھی تھی اس لئے اس نے بیٹے کو ناشتے کے لئے بھی نہ پوچھا سنت رام نے اسے روکنے کی کوشش کی اور آواز دی، "بیٹا، ناشتہ تو کر لو۔۔۔"

"نہیں ـــ" پال نے مصمم جواب دیا اور باہر نکل گیا۔ جس انداز سے اس نے پیچھے زور سے دروازہ بند کیا تھا اس سے روح تک میں تشنج پیدا ہو گیا۔

پال کے جاتے ہی دھوبن اور سنت رام میں ٹھن گئی۔ وہ

تو اسے صرف اسی فضیحتے کے سلسلے میں مطعون کر رہا تھا۔ لیکن دھوبن
ایک طرف روئے جا رہی تھی اور دوسری طرف کوسنے دے
رہی تھی۔ اس سلسلے میں وہ نئے پرانے سب دفتر کھول بیٹھی۔
اس کی باتوں سے تو ایسا پتا چلتا تھا کہ اس گھر میں آ کر اس نے
کبھی کوئی سکھ نہیں دیکھا۔ وہ بہت پھوٹی قسمت والی تھی۔
حالانکہ سنت رام سمجھتا تھا کہ اس دنیا کا کوئی سکھ نہیں جو اس
نے بیوی کو نہ دیا ہو۔ اور اگر دکھ بھی دیکھا ہے تو ساتھ اس نے
بھی تو دیکھا ہے۔ لیکن بیوی نہ صرف اپنے بلکہ پوری اولاد کو
تباہ و برباد کرنے کا ذمہ دار سنت رام کو ٹھہرا رہی تھی وہ
کہہ رہی تھی۔ "پہلے ہنستم بھائی بہنوں کے سلسلے میں مجھے ڈانٹتے
لڑتے جھگڑتے رہے۔ میرے ساتھ پھر دوست مجھ پر لاد
دیئے۔ ایک ہاتھ سے بچہ کھلا رہی ہوں اور دوسرے سے
روٹیاں پکا رہی ہوں ان بڑ کٹوں کے لئے۔ اب قصائی اولاد
کے حوالے کر دیا۔ اتنی چھوٹ دے دی۔ پیسے کپڑے کی۔ جس
سے وہ نالائق نکل آئے سب کے سب اور اب بیٹے کی یہ ہمت
کہ وہ تمہارے ہوتے سوتے مجھے آنکھیں دکھائے؟"
سنت رام حملے کی بجائے مدافعت پر اتر آیا تھا۔ واقعی وہ

کیا تھا۔ جو بیوی کو بچوں سے نہ بچا سکتا تھا اور نہ بچوں کو بیوی سے۔ جب تک لاڈو بھی جگ گئی اور آنکھیں پونچھتے ہوئے منظر کو دیکھنے لگی۔ کاش وہ تھوڑی دیر پہلے اُٹھ جاتی اور اپنے بھائی کو جانے سے روک لیتی۔ وہ میرا بیٹا ہے اس کا بھی تو بھائی ہے لیکن ماں کو روتے دیکھ کر وہ اس کی طرف ہو گئی۔ بظاہر اس نے ماں ہی کو چپ کرنے کے لئے کہا اور سنت رام کو صرف دیکھا، لیکن اس کے دیکھنے ہی میں کیا کچھ نہ تھا۔ جس سے سنت رام کے اور بھی اوسان خطا ہو گئے اور اس کے بعد وہ بچے کو سنبھالنے لگی اور گھر میں اپنے میاں کو ٹیلی فون کرنے لگی تاکہ وہ آئے اور اسے لے جائے۔ اس کے بعد ایک خاموشی سی چھا گئی۔ جس میں دھوبن کے سسکنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ یہ خاموشی! لاڈو اور دوسرے بچوں نے بھی تو یہ سمجھ لیا تھا کہ روز کا معاملہ ہے، کون اس پہ سر دھنے؟ یہ کیا میرا ہی معاملہ تھا؟ سنت رام نے سوچا۔ گھر کے کسی اور بشر کا نہیں؟ پال تو پہلے ہی سے بھرا بیٹھا تھا — ماں کے بات کرنے سے پہلے دھوبن کی بات تو صرف ایک بہانہ ہو گئی۔ وہ نہ چاہتا تھا پال کو کوئی سا بھی بہانہ دے، لیکن اس نے

نہیں تو اس کی ماں نے اسے دے دیا۔ کیونکہ وہ جل بھن گیا تھا
پیکٹ میں صرف ایک ہی سگریٹ پا کر۔ ۔ ۔ ۔

سنت رام دفتر میں داخل ہوا تو اس نے کسی کو علیک سلیک کا جواب نہ دیا۔ لیکن ان لوگوں کو کیا پروا تھی؟ "آج صاحب کا موڈ اچھا نہیں۔" کسی نے کہا۔ پھر دوسری طرف سے آواز آئی۔ "اچھا کب ہوتا ہے؟"

کیبن میں داخل ہوتے ہی چپراسی چندو سے سنت رام نے سگریٹ کا پیکٹ منگوایا۔ چندو ہمیشہ پہلے ہی سگریٹ خرید کر رکھتا تھا۔ وہ اپنی جیب سے دام خرچ کر دیتا اور جب مالک سے مل جاتے تو جیب میں ڈال لیتا۔ سنت رام نے اپنا کوٹ ٹانگا۔ پیکٹ پر سے کاغذ پھاڑا، سگریٹ نکالی، سلگایا اور کام کرنے بیٹھ گیا۔ لیکن آج سنت رام کا جی کام میں نہ تھا۔ ایک شدید ڈر نے اس کے جسم و ذہن کو ماؤف کر دیا تھا۔ اس نے گھومنے والی کرسی پر پیچھے ہٹتے ہوئے اپنی ٹانگیں میز پر رکھیں اور سگریٹ کے دو چار سچے کش لگاتے ہوئے سوچنے لگا۔ میں نے کسے تباہ کر دیا ہے گھر کے لوگوں کو؟ بیوی اور بچوں کو؟ میں معمر ہونے کے باوجود پڑھتے رہنے کی وجہ سے آج کل کے زمانے کا ہوں۔ میں نے شوہر

اور باپ بننے کی بجائے ان سے دوستی رکھنے کی کوشش کی شاید یہی قصور تو نہیں میرا؟ میں نے بیٹی سے ایسی باتیں کیں جو پرانے خیال کے باپ نہیں کرتے۔ جب وہ کالج جا رہی تھی تو میں نے کہا تھا: وہاں مخلوط تعلیم ہے لاڈو، وہاں لڑکیاں ہوں گی اور لڑکے بھی، اور لڑکے قریب ہونے کی کوشش کریں گے۔ آج کل ہماری معاشرت میں ایک نئی چیز آ گئی ہے۔ جسے گڈ ٹائم کہتے ہیں۔ گڈ ٹائم گڈ ٹائم ہے۔ لیکن مرد اور عورت میں جو بنیادی فرق ہے، اسے تم مت بھولنا۔ مرد پر کوئی ذمہ داری نہیں بشرطیکہ وہ اپنے اخلاق، اپنی تہذیب سے اسے قبول نہ کرے، لیکن عورت پر بہت ہے، کیوں کہ بچہ اسے اٹھانا پڑتا ہے۔ اسی لئے دنیا بھر میں عورتیں نہ صرف قدامت پرست ہیں بلکہ ان سے تقاضا کیا جاتا ہے: قدامت پرستی کا، اور یہ ٹھیک ہے۔ انہیں کبھی اپنے آپ کو ایسے مرد کے حوالے نہیں کرنا چاہیئے جو اس کی اور اس کے بچوں کی ذمہ داری قبول نہ کرے۔"

دھوبیں کے مرغولے میں سنت رام کو اس وقت کا بیٹی کا چہرہ یاد آیا۔ وہ بٹر بٹر باپ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کچھ سمجھ رہی تھی اور کچھ نہیں بھی۔ شاید وہ سوچتی تھی: پاپا یہ آج کیا لے بیٹھے

ہیں؟ اس بات کو تو آج کل کے زمانے کی ہر عورت، ہر لڑکی سمجھتی
ہے۔ پپا کتنے پرانے خیالات کے ہیں؟ اگر میں پرانے خیالات
کا ہوں تو روز یہ قصے کیا سنتا ہوں؟ یہ تو ایک ایسی بات ہے
جو بدھ کے زمانے میں بھی کہی جانی چاہیئے تھی اور آج کے زمانے
میں بھی۔ کیا انسان مشق اور غلطی ہی سے سیکھتا ہے؟ لیکن اس
کا نتیجہ اچھا ہی نکلا۔ جہاں اس محلے کے دوسرے بچوں نے
بدعنوانیاں کیں وہاں میرے بچوں نے نہیں۔ کم از کم لڑکیوں
نے نہیں۔ یہ اسی تعلیم کا نتیجہ تھا جو میں نے انہیں دی تو پھر
یہ تباہی کیسی؟ پال چھبیس برس کا ہو گیا تھا جب میں نے براہِ راست
اس سے پوچھا کہ اسے عورت کے سلسلے میں کوئی تجربہ ہوا ہے؟
کیوں کہ وہ بیٹا ہونے کے علاوہ میرا دوست تھا۔ اس نے
سب کچھ بتا دیا۔ اب مجھے اس بات کی فکر پڑ گئی کہ وہ تجربہ
کامیاب ہوا یا نہیں کیوں کہ جنسی فعل ایک بہت بڑی ذمہ داری
کی چیز ہے۔ اس میں کوئی سی بھی غلطی پوری زندگی پر چھا
سکتی ہے۔ اسی لئے تو مرد عورت کے بیچ محبت اور شادی
کی چار دیواری کا تحفظ لازمی ہے لیکن پال بھی میری طرف ٹر ٹر
دیکھ رہا تھا اور شاید جی ہی جی میں ہنس رہا تھا اور کہہ رہا تھا:

ہونہار! ذمے داری! پپا انیسویں صدی میں سانس لے رہے ہیں لیکن یہ طے تھا کہ بہت سی باتیں وہ نہ جانتا تھا اور میں نے اس کے دماغی جالے اور پھپھوندیاں اُتارے اور اسے اس قابل بنایا کہ وہ دنیا اور اس کے حالات کا مقابلہ کر سکے اور آج اُسی بیٹے نے اس کا ایک سگریٹ پی جانے سے منہ موڑ لیا مجھ سے!

نہیں، ہو سکتا ہے معمول کی طرح وہ کسی اپنی ہی دھن میں ہو اور جلدی گھر سے باہر نکل گیا ہو۔ فرق یہی ہے نا کہ پہلے دس کے قریب جاتا اور آج ساڑھے نو بجے نکل گیا تھا۔ کل میری ایک فرم سے لاکھ روپے کی ڈیل ہونے والی ہے، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اگر پال خفا بھی ہو گیا ہے تو راضی ہو جائے گا۔ پھر سب مل کر کلو کے پہاڑ پر جانے کا پروگرام بنائیں گے۔

لیکن، ایک سگریٹ ۔ ۔ ۔ ۔ صرف ایک سگریٹ ۔ ۔ ۔

سنت رام کا خون بار بار کھول اُٹھتا تھا، جیسے اس نے بیٹے کو معاف نہ کیا ہو، خود کو معاف نہ کیا ہو۔ مگر جو باپ بیٹے سے نفرت کرتا ہے۔ اپنے آپ سے نفرت کرتا ہے، جو بیٹا باپ سے نفرت کرتا ہے اپنے آپ سے نفرت کرتا ہے۔ پال دراصل

باپ سے نفرت نہیں کرتا تھا خود سے نفرت کرتا تھا کیوں کہ مقابلے کی اس دنیا میں جب تک وہ باپ سے آگے نہیں نکل جائے گا خود کو معاف نہیں کرے گا۔ وہ باپ سے محبت اس وقت کر سکے گا جب اسے نالائق اور بے وقوف ثابت کر دے۔

سنت رام نے گھنٹی پر ہاتھ مارا اور چندو سے کہا ڈولی کو بلاؤ۔

ڈولی اندر آئی۔ آج اس نے بالوں کے پرم بنوا رکھے تھے۔ اور چست بلاؤز کے ساتھ ایک سفید رنگ کی ساڑی پہن رکھی تھی کیوں کہ سنت رام کو سفید رنگ بہت پسند تھا لیکن سنت رام نے ڈھب سے اس کی طرف نہ دیکھا۔ ڈولی جانتی تھی، آج کل بوس کٹا سا رہتا ہے۔ اس نے بھی دنوں سے بزنس کا انداز اختیار کر رکھا تھا۔ یہ تو اس کا کرم تھا کہ ایک بڈھے آدمی سے باتیں کرتی تھی۔ وہ کام کرتی تھی تو پیسے لیتی تھی، بیچ میں وافر باتیں کیسی؟

اندر آنے کے بعد جب ڈولی نے "یس سر" کہا تو سنت رام نے پھسلتی ہوئی نظر اس پر ڈالی اور اپنے آپ کو کہنے سے روک لیا کہ تم بہت خوبصورت لگتی ہو ڈولی!

لیکن ایک لمحے کے لئے اس کا دل، جو کہیں بھی چھٹکارا پانے کے لئے تڑپ رہا تھا، ڈولی کے خوبصورت بالوں میں اٹک گیا۔ یہ عورتیں بھی خوب ہیں۔ اگر مرد کا دل سیدھے بہاؤ میں نہ بہے تو اسے لہروں اور اس کے ہچکولوں میں ڈبو دو۔ مگر سنت رام نے جلدی ہی اپنی آنکھیں اس طوفانی بہاؤ سے اور پیچھے کے بھنور سے ہٹا لیں اور دائیں طرف دواکستا سو کے کیلنڈر دیکھنے لگا۔ جیسے اسے کوئی تاریخ دیکھنا ہو۔ ایسی حرکتوں کو عورت خوب سمجھتی ہے اور اپنی نظریں اپنے شکار پر گاڑے رہتی ہے۔ مرد جانتا ہے کہ اس نے عورت کی آنکھوں میں دیکھا تو گیا، اس لئے وہ پرے، اور پرے سے پرے، دیکھنے اور بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن کب تک؟ آخر منٹ کے سوویں حصے کے لئے وہ مجبوری اور بے اختیاری کے عالم میں پھر اس کی طرف دیکھ لیتا ہے اور یہ وہ لمحہ ہوتا ہے جس میں اس کی آخری پھڑپھڑاہٹ ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔

سنت رام نے ڈولی سے پوچھا: "پرکنز کہاں ہے آج کل؟"

پرکنز ڈولی کا بھائی تھا — جاہن پرکنز۔

"یہیں ہے۔" ڈولی نے جواب دیا اور تھوڑا مسکرانے کی

کوشش کی۔ وہ سنت رام کے اس سوال کو ادھر اُدھر کی باتوں میں سے سمجھتی تھی جو مطلب پہ آنے سے پہلے مرد ہمیشہ کرتا ہے۔ لیکن وہ تو سخت بزنس کا محل روا رکھنا چاہتی تھی۔ آخر کوئی مذاق ہے؟ جب چاہے بلا لو، جب چاہے جھٹک دو۔ اتنے دنوں تک بات ہی نہیں کی، دیکھا تک نہیں اور گزر گئے اور آج ایکا ایکی پرکنسر یاد آیا ہے!

لیکن ڈولی بھی کب تک بزنس کا انداز رکھ سکتی ہے؟

سنت رام نے ڈولی کو نادانی کے عالم میں سگریٹ پیش کر دیا۔ ایک لہر سی ڈولی کے بدن میں دوڑ گئی جو اس کے بالوں کے پرم سے زیادہ مضطرب تھی۔ اس نے اپنے بڑھتے ہوتے ہاتھ روک دیئے اور بولی: "نو، تھینکس۔" اور پھر غصے اور شکایت سے اس کی چھاتیاں اُوپر نیچے ہونے لگیں۔ سنت رام نے اس کی نظروں میں اپنی نظریں گاڑتے ہوتے ایک رونے انداز میں کہا: "ڈول ...."

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سنت رام کہنے جا رہا ہو: دنیا نے میرے ساتھ یہ سب کیا ہے۔ گھر کے لوگوں نے کیا ہے۔ ایک تم نہیں جو ایک معمولی سے "ریڈ" کے لئے مجھے التفات کا

دھوکا دے سکتی تھیں۔ اور نرم نے دھوکا دیا اور وہ مجھے ملیبی محبت لگی جو سچی محبت سے کہیں اُوپر ہوتی ہے۔ اس میں وہی فرق تھا جو اصلی بوسے اور چوری کے بوسے میں ہوتا ہے جس میں پچھلا لاکھ روپے کا گھاٹا اور آنے والا لاکھ روپے کا نفع بڑے خوبصورت طریقے سے ایک دوسرے میں حل ہو جاتے ہیں۔ ڈولی نے سنت رام کی طرف دیکھا، ورنہ وہ اور بھی بوڑھا ہو جاتا اور اسے ایک کی جگہ کئی اور گھاٹے پڑ جاتے جن سے وہ خود بھی بے کار ہو جاتی۔ اس نے اپنے رحم کی نتھوں سے سوچا جو اس کی ماں تھی، اور دنیا بھر کے مردوں کی ماں، چاہے وہ جوان ہوں یا بوڑھے۔ پھر آل رائٹ کہتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ سگریٹ کی طرف بڑھایا۔ سنت رام نے لائٹر جلا کر ڈولی کا سگریٹ سلگایا۔ ڈولی نے کش لگا کر دھواں چھوڑتے ہوئے ایسے ہی سگریٹ کی طرف دیکھا۔ پھر دوسرا کش لگانے کے بعد وہ اپنی سیٹ پر سے اُٹھی یا پیچھے کیبن کے دروازے کی طرف دیکھتی ہوئی سنت رام کی طرف بڑھی۔

جبھی سنت رام نے کہا: ”پرکنز شہر میں ہے تو اسے کہو۔“ ڈولی وہیں رک گئی اور اس کی طرف دیکھنے لگی تاکہ وہ اپنا

فقرہ مکمل کر دے بسنت رام نے کہا، "مجھے اسٹیٹ ایکسپریس کا ایک کارٹن لادے، پیسے پھر دے دوں گا۔"

"آل رائٹ،" ڈولی نے کہا اور پیچھے ہٹتی ہوئی وہ کیبن سے باہر نکل گئی۔

بسنت رام گھر پہنچا تو کارٹن کی قلعہ بندی کے باوجود وہ ڈر رہا تھا۔ ایک نہیں بیسیوں واہمے دامن گیر تھے اس کے جن کے بارے میں وہ دھوبن یا لاڈو سے نہ کہہ سکتا تھا۔ اس کے پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد ہی پال چلا آیا۔ بسنت رام کے جسم میں جو کپکپی پیدا ہو رہی تھی بند ہو گئی، بلکہ ایک عجیب طرح کے سکون، نرمی اور گرمی کا احساس ہوا اسے، جیسے سردیوں میں کمرے کے اندر بخاری جلا دے۔ لیکن پھر وہی ڈر اس کے جسم و ذہن کا احاطہ کرنے لگا۔ کہیں اپنے کپڑے لتے اٹھانے اور گولف لنکس کے کمرے میں منتقل ہو جانے کے لئے تو نہیں آیا، پال؟ مگر اس کے تو کوئی آثار نظر نہ آتے تھے پھر وہ آج جلدی کیوں چلا آیا تھا؟ وہ تو کبھی نہ لوٹا تھا رات کے ایک دو بجے سے پہلے!

کیا وہ اچھا بیٹا، راجا بیٹا ہو گیا تھا؟ لیکن اچھا بیٹا ہونے

کے باوجود وہ چپ کیوں تھا؟ وہ لاڈو کے ساتھ بات کر سکتا تھا، اور نہیں تو بابی کے ساتھ کھیل سکتا تھا۔ کمبخت! کس قدر بغض سے بھرا ہوا تھا اس کا سینہ۔ لیکن پال نے کوئی کپڑے وپڑے اکٹھے نہ کئے۔ وہ ایک منٹ کے لئے اپنے کمرے کی طرف گیا اور پھر باہر آتے ہوئے باپ کی طرف گیا اور جیب سے ایک پیکیٹ نکال کر پپا کو پیش کر دیا۔ سنت رام نے دیکھ اور پوچھا: "یہ کیا؟"

"رشین سوبرائین۔"

رشین سوبرائین سگریٹ — اور پورا پیکیٹ! خون سنت رام کے کانوں اور آنکھوں تک آنے لگا۔ یہ ایک سگریٹ تو کیا لیا ہے اس کا، اس کے عوض پورا پیکیٹ لاتے دے رہا ہے جوتا مار رہا ہے ایک طریقے سے۔ سنت رام نے پیکیٹ اٹھایا اور پورے زور سے پال کے منہ پر کھینچ مارا۔

"دیکھئے، شہدے، حرامی۔" سنت رام کہہ رہا تھا، "تو کیا سمجھتا ہے میں اپنے سگریٹ بھی نہیں خرید سکتا؟ تجھے خرید نہیں دے سکتا؟ اتنا تو نہیں مرا ہوں جتنا تو سمجھتا ہے! یہ تو تیرے ایسے سو کمینوں کو خرید کے رکھ لوں اور جیب میں

ڈال کے چل دوں، باسٹرڈ!"

پال کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ ہونٹ پر رکھ لیا جس پہ پیکٹ کے لگنے سے ایک کٹ سا چلا آیا تھا اور خون کا ایک نقطہ سا دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے کہا بھی تو صرف اتنا: "پپا!"

لاڈو بیڈ روم سے دوڑی ہوئی آئی اور اس نے بھی اتنا سا کہا: "پپا!" پھر دھوبن لڑتی ہوئی بولی: "کیا ہوا جی؟"

"کچھ نہیں۔" سنت رام نے سب کو پیچھے دھکیلتے ہوئے کہا، "مجھے اس پلے سے اپنا حساب برابر کر لینے دو۔ بہت دیر ہو گئی اسے ٹھکے ہوئے۔" پھر اپنے بیٹے کے چہرے پر خون کا قطرہ دیکھ کر سنت رام اور ڈر گیا، اور بھی وحشتناک ہو گیا کیونکہ بیٹے کا خون دیکھنا کوئی آسان بات نہیں۔ دیکھنے والے کو بظاہر وہ بیٹے کا خون معلوم ہوتا ہے لیکن خون اس کا ہوتا ہے جس کا وہ خون ہے۔ اور بھی آگے لپکتے ہوئے، منہ پر کف لاتے ہوئے سنت رام کہہ رہا تھا: "میں تجھے جان سے مار دوں گا آج۔ چھوڑ دو، چھوڑ دو مجھے۔ یہ بھی ایک مثال ہو جانے دو۔ بیٹے باپ کا خون کرتے آئے ہیں، آج باپ کو بیٹے کا خون

کرنے دو۔ مادر۔ ۔ ۔ ۔ میں نے تجھے کیا نہیں دیا؟ تو باہر پنجاب پڑھنے کے لئے گیا تو چار سو روپیہ مہینہ بھیجتا رہا۔ پھر تو وہاں سے بھاگ آیا اور میرے دوست نے دو برس تجھے اپنے ہاں رکھا ورنہ تجھے کون پوچھتا ہے۔ چیتھڑے کو؟ اور پھر بھی پیسے بھیجتا رہا، میرے بیٹے کو تکلیف نہ ہو، اور تو اس سے ہوٹلوں اور ریسٹورانوں میں جاتا اور ہر قسم کی بدمعاشیاں کرتا رہا۔ تیرے اپنے بکنے کے مطابق تیرے دوست تجھے شہزادہ کہتے تھے کیوں کہ تو باپ کے مال پر عیش کرتا تھا۔ پھر تو نے بی۔ اے میں کمپارٹمنٹ لی اور امتحان کو پورا نہ کیا کیونکہ تو ہندی میں فیل ہو گیا تھا۔ ہندی بھی کوئی بات تھی بھلا؟ میں نے کتنی تجھ سے منتیں کیں کہ ایک مضمون ہے، پاس کر لے، لیکن تجھے اس سے چڑ ہو گئی۔ پھر بھی میں نے تجھے کچھ نہ کہا۔ چھبیس برس کی عمر تک تجھے گھر رکھا اور روٹیاں کھلاتا رہا۔ ہوتا کسی باہر کے ملک میں تو اٹھاروں پھاند نے ہی باپ تیرے چوتڑ پر لات مارتا اور باہر نکال دیتا۔ یہ اپنا ہی ملک ہے۔ جس میں اس قسم کی چرنیا پنتھی چلتی ہے۔ جب تیری جیب میں پیسے نہیں ہوتے تھے تو میں تیری ماں کی چوری سے دس بیس پچاس ڈال دیتا تھا؟

اور آج یہ اسی کا کارن ہے کہ وہ مجھے آنکھیں دکھاتی ہے اور کہتی ہے کہ میں نے اپنی اولاد کو تباہ کر دیا۔ تیری وجہ سے میں نے اپنی زندگی برباد کر لی۔ یہ تیرا ہی فقرہ ہے نا کہ میری ماں جس قسم کی عورت ہے اس سے تو میرا باپ کوئی داشتہ رکھ لے۔ بول کہا نہیں تو نے؟ جو بیٹا ماں کے بارے میں یہ کہہ سکتا ہے۔ وہ باپ کی بابت کیا کہے گا۔ روز تو ماں کو گالی دیتا ہوا نکل جاتا ہے اور جانتا ہے وہ گالی کسے پڑتی ہے؟ وہ تجھے گالی دیتی ہے تو گالی کسے پڑتی ہے؟ کیا اس گھر میں کوئی مالک نہیں، کوئی باپ نہیں؟ کیا ہوا جو ایک بار، زندگی میں صرف ایک بار، گھاٹا پڑ گیا۔ میں نے لاکھ روپیہ گنوایا ہے تو آج ہی لاکھ روپے کا کانٹریکٹ کیا ہے جس میں سے کچھ نہیں تو تیس پینتیس ہزار بچ جائیں گے۔ جب تو تیری ماں بھی خوش ہوگی اور یہ لاڈو بھی جو اس دن باپ کی بجائے مجھے انکل کہہ گئی، اور تو بھی خوش ہوگا اور فخر سے میرا نام لے گا، میرے پاس ہو ہو کر بیٹھے گا اور باتیں کرنے کی کوشش کرے گا۔ لیکن میں تم سب کو سمجھ گیا ہوں، منہ نہ لگاؤں گا کسی کو۔"

پال کے ہونٹ پھڑکنے لگے تھے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا بھی

تو صاف اننا: "پر پپا، میں نے کیا کیا ہے؟"

"تم نے؟" سنت رام اور بھی بلند آواز سے چیخا: "تم نے مجھے گالی دی ہے، جو کسی نے نہیں دی، کسی کی ہمت ہی نہیں پڑی، سب جانتے ہیں۔ میں خالی ہاتھوں سے ان کی بوٹیاں اڑا دوں گا۔ تیری یہ ہمت کہ ایک سگریٹ تیرا پی جانے سے تو پورا پیکیٹ میرے منہ پر دے مارے؟"

"ایک سگریٹ؟" پال نے کہا۔

"ہاں۔" سنت رام نے کہا، "تجھے پتا چل گیا نا میں نے تیرا ایک اسٹیٹ ایکسپریس صبح پی لیا تھا۔"

"نہیں، مجھے نہیں معلوم۔"

اس سے پہلے کہ سنت رام، جو کانپ رہا تھا، نیچے گر جاتا۔ بیٹے نے بڑھ کر تھام لیا اور اٹھا کر اسے اندر کے بیڈ روم میں پلنگ پہ ڈال دیا۔ جبھی بابی اپنا بالنس لیتے چلا آیا اور آتے ہی اس نے پال کو جڑ دیں اور بولا: "تم نے پپا کو مارا، ہم تم کو مارے گا۔"

اگلے روز سنت رام حسب معمول صبح کے چار بجے اٹھ گیا تھا۔ اسے پھر سگریٹ کی طلب ہوئی۔ دھوبن کو ڈسٹرب کئے

بغیر وہ ساتھ کے کمرے میں چلا آیا جہاں پال، لاڈو، اور اس
کا بچہ بابی سوئے تھے۔ سنت رام نے زیرو پاور کا بلب جلایا
اور ان کی طرف دیکھنے لگا۔ ہلکی، مدھم سی روشنی میں وہ کتنے
حسین لگ رہے تھے۔ ایک سے ایک خوبصورت اور خوشبودار!
آج بابی کی بانہہ ماں کے گلے میں نہ تھی، وہ آزاد اور بے فکر
سو رہا تھا۔ سنت رام نے سوچا۔ کالج بھیجنے سے پہلے میں نے اس بچی
کو لیکچر دیا تھا، لیکن اگر یہ کوئی بے راہ روی کرتی تو کیا میں اسے
سڑک پر پھینک دیتا؟ پال کا تجربہ ناکام ہوتا تو میں اسے
زندگی کا کھیل نہ سکھاتا؟ یہ اخلاق، یہ تہذیب ــــ سب باتیں
ہیں۔ یہ اور یہاں سے باہر کے سب بچے ہیں جو کھیلتے ہیں، گرتے
ہیں اور پھر اُٹھ کر کھیلنے لگتے ہیں۔ دھوبن ـ؟ دھوبن بے وقوف
ہے، وہ نہیں جانتی کچھ بھی، سوائے کپڑے دھونے کے۔

سنت رام نے اسٹیٹ ایکسپریس کا کارٹن نکالا اور اسے
بیٹے کے سرہانے رکھ دیا۔ رات اس جھگڑے کی وجہ سے وہ
اسے بیٹے کو دے ہی نہ سکا تھا۔ چلو، یہ اور بھی اچھا ہوا۔ جاگے
گا تو ایک دم پورا کارٹن پا کر وہ کتنا خوش ہوگا۔ پھر سنت رام
بیٹے کے دیتے ہوئے رشین سوبرانین کا پیکیٹ ڈھونڈنے لگا۔

پیکٹ وہیں پڑا ہوا تھا جہاں وہ رات کو گرا تھا۔ سنت رام نے اسے اٹھایا اور اس سے پیار کیا، پھر اس میں سے سگریٹ نکالا اور جلایا اور دھوئیں کے بڑے بڑے کش چھوڑے۔ زیرو پاور کے بلب کی روشنی پہلے ہی کچھ نہیں ہوتی، اس پر دھوئیں نے اور بھی منظر کو دھندلا دیا۔ بچے فرشتوں سے بھی زیادہ حسین معلوم ہو رہے تھے۔ سنت رام کا جی چاہا کہ وہ آگے بڑھ کر پال کے گھنے بالوں میں پیار سے ہاتھ پھیرے، اس کا منہ چومے۔ لیکن کہتے ہیں: سوتے میں بچے کا منہ نہیں چومتے جانے کیوں؟ اس وقت تو سنت رام نے یہی سوچا کہ اگر اس نے ایسی حرکت کی تو وہ جاگ جائیں گے۔

سوبرائن کے چوتھے کش میں کوئی نشہ تھا یا شاید ایسے ہی سنت رام کی آنکھیں بیٹے کی شراب سے چڑھ گئی تھیں۔ اس نے دھواں صاف کرتے ہوئے ایک بار پھر سب کی طرف دیکھا اور پھر پرارتھنا کے لئے پوجا کے کمرے کی طرف چل دیا۔

سرب دیال

ہاں بھئی مجھے ہی پہاڑی کوا کہتے ہیں۔

میرا اصلی نام سرب دیال ہے، یعنی سب پہ مہربان، اور میرے والد کا نام دیوی دیال، یعنی جو دیوی پہ مہربان ہو یا یوں کہ جن پہ دیوی مہربان ہو۔ میرے والد کبھی کے سورگباش ہو چکے۔ ہر کسی کے تھوڑے بیٹھے رہتے ہیں۔ جیسے آپ کے چل دیئے ویسے میرے بھی چل دیئے۔ میں ذات کا کھتری ہوں اور میری گوت سرنا ہے، لیکن میں عام طور پر اپنے نام کے پیچھے کوشل لکھ لیتا ہوں ہاں، جس کی کوئی گوت نہ ہو یا وہ اپنی گوت نہ جانتا ہو اور یا پھر اسے اپنی گوت نہایت لغو معلوم ہو وہ بے کھٹکے اپنے نام کے پیچھے یہ دم لگا سکتا ہے اور پھر اسے لہرا سکتا ہے، اور کہیں زیادہ غصے میں آئے تو مہابیر جی کی طرح اس دم میں آگ لگا کے کسی کی بھی لنکا پھونک سکتا ہے۔

جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں مجھے اپنا نام بدلنے کی کبھی ضرورت

ہی نہیں پڑی۔ آج سے پینتالیس سال پہلے، گاؤں کے مدرسے
میں داخل ہونے سمے، میرے باپ نے میرا اصلی نام لکھوایا تھا۔
لیکن وہاں بھی کیفیت کے خانے میں ستم ظریف مدرس نے میرا
مروجہ نام لکھ دیا۔ بہرحال، مجھے کوئی افسوس نہیں۔ اس کے دس
سال بعد میٹرک کی سند پہ اپنا نام سرب دیال کوشل دیکھ کر مجھے
خود ہی اچنبھا ہوا۔ اپنے نام کے بارے میں کوئی حیران نہیں ہوتا،
بلکہ کوئی اس کے بارے میں غور ہی نہیں کرتا، لیکن میں صاف
بات کہتا ہوں۔ مجھے اپنا نام دیکھ کر ضرور حیرانی ہوئی اور خوشی
بھی۔ میرے جی نے کہا: دنیا چاہے کچھ ہی کہے، لیکن یہاں میرا
نام پکا ہو گیا ہے۔ ایک نیم سرکاری سند میں اس بات کو مانا گیا
ہے کہ سرب دیال کوشل، جو دیوی دیال سرنا کا بیٹا ہے، ۸ ستمبر
۱۹۰۷ کو پیدا ہوا اور اس نے پنجاب یونیورسٹی سے دوسرے
ڈویژن میں انٹرنس پاس کی۔

اب میں جس کے سامنے وہ سند رکھتا ہوں وہ فوراً مان
جاتا ہے کہ یہی سرب دیال ہے۔ ہماری اس دنیا میں کوئی کسی
کی بات نہیں مانتا تا وقتیکہ اسے لکھ کے یقین نہ دلایا جائے اور
جب کوئی چیز لکھ کے اس کے سامنے پیش کر دی جائے تو وہ

اتنی جلدی تسلیم کر لیتا ہے کہ سارا سلسلہ ہی محض معلوم ہونے لگتا ہے۔
آپ چلاتے جائیے کہ آپ سرب دیال ہیں، سرب دیال ہیں۔،
سرب دیال ہیں لیکن وہ نہیں مانے گا، آپ کی بات کو کسی کوے
کی کائیں سے زیادہ اہمیت نہیں دے گا، لیکن جب . . .

میں پہاڑ کا رہنے والا ہوں۔ پہاڑ میری زندگی کا جزو ہے۔
میں بائیس سال کے عرصے سے ادھر میدانوں میں ہوں لیکن یہاں
مجھے وہ بات نہیں ملتی جو پہاڑ میں ملتی ہے۔ جہاں کبھی آپ اپنی
پگڑی سنبھال کر آسمان کی طرف دیکھتے ہیں اور کبھی کیکپی سے
کر نیچے زمین کی طرف۔ پہاڑوں میں آپ کو عجیب طرح نغمگی
ملتی ہے جس میں اداسی اور کاہش زیادہ ہوتی ہے۔ ایک پہاڑ
سے دوسرے تک آواز پہنچ جاتی ہے۔ لیکن آدمی نہیں پہنچ سکتا
درمیان میں کوئی گہری کھائی یا نالہ والا آجاتا ہے۔ جیسے پار کرنا
ناممکن ہوتا ہے۔ چنانچہ بیار کی لڑکی موہن جھولا کے لڑکے کو
پکارتی ہے تو ہمیشہ یہی کہتی ہے: چندا کہاں ملاں، چندرے کتھے
ملاں، چاند! مجھے کیسے ملوں، جان! کہاں ملوں؟ اور لڑکا جواب
میں کہتا ہے۔ چاندنی کوئی دن ٹھہر۔ اب کے میری بکریوں کے
بال اتنے لمبے اُگ آئے ہیں کہ وہ چلتی ہیں تو پیروں میں اٹک

جانتے ہیں، میں ان بالوں کو کاٹ کے رسہ بناؤں گا ـــ اتنا لمبا، رسہ جو دنیا کے ایک سرے کو دوسرے سے ملا دے گا۔ دور، نیچے کھڈ کے کنارے آ کر اس کا ایک سرا میں تیری طرف پھینکوں گا، جسے تو اوپر لے جانا اور دشٹ مندر کے ستون سے باندھ دینا۔ وہ ستون جس کے اوپر بڑے بڑے چمگادڑ لٹکے رہتے ہیں۔ دوسرے سرے کو میں اپنے ڈھارے کے پیپل سے باندھ دوں گا، کیوں کہ اس پیپل نے پیار کرنے والوں کی ہمیشہ مدد کی ہے اور جب چچا، تاؤ، ماموں اور گاؤں کا نمبردار، ٹھاکر میہان سنگھ، اس محبت کو تیوروں سے دیکھتے ہیں، ہمارا یہ پیپل اپنے پتوں سے تالیاں بجاتا ہے۔ بس، ایسے ہی اماوس کی ایک رات کو اس رسے پہ ہاتھ چھیلتا ہوا میں تیرے پاس چلا آؤں گا۔

اور اس کے بعد چندا رات کی تعریف میں جٹ جاتا ہے:

دن اچھا نہیں ہوتا۔ رات کتنی اچھی ہوتی ہے۔ پیار کرنے والوں کو اپنے دامن میں چھپا لیتی ہے اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ لپٹے ہوئے ایک دوسرے کے جسم کو ٹٹولتے ہیں گویا یہ بھی کوئی سیڑھی ہے جس کی مدد سے وہ کوئی روحانی منزل طے کر رہے

ہوں، انڈ، پنڈا ور برہمانڈ کی خبر لائیں۔

اور سارے گیت ہیں "ہو، ہو، ہو" کی ایک مسلسل آواز ہوتی ہے جو گونجتی ہی چلی جاتی ہے۔ جو نہ صرف وادیوں کے نشیب کو پاٹ دیتی ہے بلکہ دلوں کے تمام کونے کھدرے بھر دیتی ہے۔ ارمانوں کے وہ ستون، جن پر خیالات کے چمگادڑ لٹکتے رہتے ہیں ایک تار کے ساتھ وابستہ کر دیتی ہے اور چپکی دبکی محبت چلی آتی ہے۔ جب گھنٹیاں بجنے لگتی ہیں، ایک ایسی شہنائی کی آواز آتی ہے جو کسی اتصال پہ نہیں آتی، ایک ایسی اُمنگ اٹھتی ہے جو کبھی نہیں اُترتی۔ کل ہی مجھے کسی نے کہا تھا، "یہ پہاڑی لڑکیاں اس لڑکے ہی سے کیوں پیار کرتی ہیں جو سامنے کے پہاڑ پہ رہتا ہے اور جس کا ملنا بے حد مشکل ہے۔" تو میں نے کہا تھا: اول تو انسان آسمان کو ٹکٹکی لگانا ہی پسند کرتا ہے اور اسے اسی پیار میں مٹھاس ملتی ہے جو ہاتھ پسارنے ہی نہ مل جائے اور دوسرے یہ ایک تلازمہ ہے۔ ایک ہی گاؤں کا لڑکا اور لڑکی آپس میں پیار کرنے بھی لگیں تو لڑکا تلاشِ معاش میں کہیں دور چلا جاتا ہے کیوں کہ ہمارے پہاڑوں میں بھٹوں اور دھان کے سوا کوئی چیز پیدا نہیں ہوتی۔ غرضیکہ پتھر اور چٹانیں انسانی محنت کا سر پھوڑتی ہیں، جہاں کہیں

زمین تھک ہار کے لیٹ جاتی ہے۔ ایک بڑے محذوش سے دردِزہ کے ساتھ چند چیزیں اُگا دیتی ہے۔ مثلاً جیسے ہمارے یہاں کھٹے انار اُگتے ہیں جو میدانوں میں رہنے والے لوگوں کے سالن کا ذائقہ بڑھاتے ہیں۔

گویا پہاڑوں میں پیار کرنے والے ایک دوسرے سے جدا ہی رہتے ہیں۔ میں تمہیں اپنی مصیبت کا کیا بتاؤں؟ ہماری عورتوں کے پیٹ میں بچے کسی کے اور دل میں پیار کسی کا ہوتا ہے۔

تم نے ہمیں اپنے وطن میں نہیں دیکھا۔ کم سے کم سخت سردی کے دنوں میں نہیں دیکھا۔ جب ایسا معلوم ہوتا ہے ہم نے جو بات کی منہ سے نکل کر جم گئی اور جب برابر کا آدمی اس کا جواب دیتا ہے تو یوں نظر آتا ہے جیسے اس نے ہماری باتوں کی برف کو پکڑ کر رکھ لیا اور اب فرصت سے بیٹھا اسے تورے پہ پگھلا کے سن رہا ہے اور ہولے ہولے اس کا جواب دے رہا ہے۔

پھاگن اور چیت میں ہم سب اپنے اپنے ڈیروں میں چپکے دبکے پڑے رہتے ہیں۔ سامنے آگ جلتی رہتی ہے جو آتش پرستوں کی آگ کی طرح کبھی سرد نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی کوئی ہاتھ بڑھا کر آگ میں ایک چیلی ڈال دیتا ہے اور پھر وہ محسوس کرتا ہے

اس کا آگا گرم ہے لیکن پیچھا بدستور یخ۔ ایک ہی بدن میں گرمی
اور سردی کی کشمکش اسے کاش تم نے دیکھی ہوتی اور پھر
سردیوں کی آگ بھی کیا چیز ہے! کوئی قریب آئے تو جل جائے،
دور ہٹے تو جم جائے۔ ہماری کیفیت ان ڈرے ہوئے بچوں
کی سی ہوتی ہے جو کسی نامعلوم دیو کے خوف سے گھبرا کر اپنا منہ
ہاتھوں سے ڈھانپ لیتے ہیں۔ صرف منہ ان کا باقی کھلا ہوا
جسم روح سرد کر دینے والے خوف سے سمٹا رہتا ہے۔

اور ہم بیٹھے پہروں آگ کی طرف دیکھتے رہتے ہیں۔ درمیان
میں عورتیں ہمیں موٹا اور لال لال بھات کھانے کو دیتی ہیں جو
ہمارے چہرے پہ تمازت اور بدن میں ایک جان سی لے آتا
ہے، جو جسم کی گرمی کو صرف ہونے سے بچاتا ہے، پیٹ کے
ٹھنڈے ہوتے ہوئے چولہے کے لئے ایندھن کا کام دیتا ہے
کھاتے کھاتے ہماری انگلیاں سرد گرم ہو جاتی ہیں۔ کہیں
پیچھے سے "اوئی مری گئی" کی آواز آتی ہے اور ہم پیچھے مڑ
کے نہیں دیکھتے۔ بات صرف اتنی ہوتی ہے کہ باہر سے کوئی
البیلا آتا ہے۔ پہلے تو ہاتھ رگڑ رگڑ کے گرم کرتا ہے، پھر ہاتھوں
کو مٹھی کی شکل بنا کر اس میں گرم گرم سانس کی دھونکنی چلاتا

ہے اور جب وہ اس پر بھی گرم نہیں ہوتے تو وہ الگنی کے نیچے پڑی ہوئی اپنی محبوب بیوی کے کرتے میں داخل کر دیتا ہے۔ وہ ہلکا سا شور مچاتی ہے اور پھر خود ہی اس کے ہاتھوں کو پکڑ لیتی ہے، اپنے کرتے میں بھینچتی ہے اور پھر ایک معنی خیز خاموشی چھا جاتی ہے۔

مصیبت اس وقت ہوتی ہے جب کھانے کے لئے کچھ نہیں رہتا۔ پہاڑ کی تقریباً ساری مکی باہر نکالنے کے لئے سولن کی بریوری میں بھیج دی جاتی ہے اور جو تھوڑی بہت بچ جاتی ہے وہ سب کے لئے ناکافی ہوتی ہے اس وقت لوگ محض قوتِ ارادی کے بل پر باہر نکلتے ہیں اور اِدھر اُدھر نگاہ دوڑاتے ہیں اور ان کی نگاہ ہائیڈرو الیکٹرک کے بڑے بڑے کھمبوں اور تاروں پر جا ٹکتی ہے جو پہاڑی بستیوں پر سے گذر جاتے ہیں اور ان تاروں پر کہیں کوئی پہاڑی کوا بیٹھا نالے کے انداز میں غائیں غائیں کرتا ہے اور نیچے سنسان وادی میں اس کی خوفناک آواز گونج جاتی ہے۔ پھر کہیں کھمبے پر لکھا ہوتا ہے:

خطرہ:....۱۱ وولٹ۔

اور اس کے نیچے ایک انسانی کھوپڑی کی تصویر ہوتی ہے اور ہڈیوں کا ایک کراس اور پھر وہی کوے کی غائیں غائیں۔ اس کے بعد میدانوں میں بھاگ جانے کو جی چاہتا ہے۔

ایسی ہی ایک سردی، ایسی ہی ایک بے کاری اور مفلوک الحالی سے گھبرا کر میں نے میدانوں کا رخ کیا۔ جب میری سلونی ماں میری رانی ماں مر چکی تھی اور تم تو جانتے ہو ماں کے سوا کسی کو رونا نہیں آتا۔ باپ تھا گٹھیے کا مارا ہوا، دبلی دیاں۔ اُٹھنے کی ایک مفلوج کوشش میں تین بار اس کا صافہ کھلا۔ تینوں بار اس نے ناشائستہ، نازیبا اور بھدے طریقے سے اسے لپیٹ لیا۔ پھر میرا وہ جنم داتا اپنی رعشہ دار آنکھوں سے کچھ کہنے، کچھ سمجھنے لگا۔ اپنی جیکٹ آستین سے اس نے آنکھوں کا میل پونچھا اور ریک سی ناک پونچھی اور کہنے لگا "جا... جا بیٹے... جا اسی راستے جس راستے سب گئے۔ اس کے علاوہ گھر میں بھائی تھا، بھابی تھی اور ان کا ایک بچہ تھا۔ شروع میں انہوں نے میرے جانے کی مخالفت نہ کی شاید اس خیال سے کہ بھی جانتے ہیں لیکن جب میں چلنے لگا تو میرے بھائی کو پتا چلا کہ وہ کیا کھو بیٹھا ہے۔ جبھی اس کے بازو اکڑ گئے اور میٹھی زبان اور میٹھی بولی والی میری بھابی کا دل یوں کانپنے لگا جیسے

پیٹھے کی مٹھائی پہ لگا ہوا سونے کا ورق کا پنّا ہے۔ اس سے کچھ نہ بن پڑی تو اس نے میرے بھتیجے کو آگے کر دیا وہ میرا بھتیجا۔ جس کی اس کے باپ نے پروا نہ کی، جسے میں نے پالا اور وفورِ محبت میں جسے میں نے اس کے اپنے ہی باپ کو گالیاں دینا سکھائیں۔ اس نے بازو میری طرف پھیلا دیا۔ میں نے زندگی میں بڑی پرکھشا دیکھی ہے پر ایسی نہ دیکھی تھی۔ جہاں سب کے من ڈول رہے تھے وہاں اس بچے کا من ستھرا تھا، جیسے کہہ رہا ہو: "دیکھوں تو کیسے جاتا ہے"، اور میں بس چلا آیا۔

راستے میں چٹانوں نے روکا، چیڑھوں نے ٹوکا۔ بھٹے برف کے سمور وسنجاب میں سے گردنیں نکالے مجھے جانے سے منع کر رہے تھے۔ پھر کہیں دور سے آواز آئی جس کے ٹھنکوں کی تھرتھراہٹ نے ٹنڈ منڈ پیڑوں پر سے برفیں گرا دیں۔ سامنے ایک دھندسی پھیلی ہوتی تھی۔ میں جا رہا تھا اور مجھے یوں معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے فنا کا مسافر خلود کی دھندلی بستیوں میں داخل ہو رہا ہے اور وہ آواز اس کی رہنمائی کر رہی ہے: کبھی روکتی ہے، کبھی چل دینے کو کہتی ہے: راستہ بتاتی ہے۔ راستہ گم کر دیتی ہے۔

وہ آواز سامنے پہاڑ پر سے آ رہی تھی۔ وہ ننھی رننی کی آواز

جس سے میں نے اپنے جانے کا راز چھپا رکھا تھا لیکن جو سب کچھ جان گئی تھی۔ میں اس سے پیار کرتا تھا اور اسے پی پی کہا کرتا تھا۔ کیوں کہ اس کی آواز بڑی پتلی تھی، بالکل ایسی نھی جیسی ہم پیپل کے پتوں کی سیٹی سے نکالا کرتے تھے۔ وہ گا رہی تھی۔ ایک مشہور پہاڑی گیت:

اساں نہری جانا، ہو اساں نہری جانا

ہم چلے جائیں گے، ارے، ہم چلے جائیں گے۔ اور مجھے یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے میرا وقت آ چکا ہے۔ میں ہونٹوں سے بے مروتی کی سیٹیاں بجاتا ہوا ان بلندیوں سے اُترا اور ان بستیوں میں چلے آنے میں شاید ایک یہ جذبہ بھی تھا: میں بہت سا کماؤں گا، بہت سا جمع کروں گا اور واپسی پر بھابی کو بندلو بنوا دوں گا پی پی کو ستھنو سلوا دوں گا اور باپ اور بھائی اور بھتیجے کو خیر چھوڑو۔ ان سب باتوں کے علاوہ میرا ایک یہ بھی مقصد تھا کہ پی پی سے شادی کروں گا، پیپل کے انہی پتوں کی سیٹیاں بجاؤں گا۔ لیکن شہر کے مردنگ نقاروں نے ان نرم و نازک سیٹیوں کی آواز ڈبو دی۔ یہاں شہروں میں آدمی اکثر اتنا ہی کما پاتا ہے جس سے بمشکل اپنا ہی پیٹ بھر سکے۔ کئی حادثے ہو جاتے ہیں، کوئی ناگاہ

بیماری آجاتی ہے کسی دوست پہ مصیبت آن پڑتی ہے جس میں اس کا ہاتھ بٹانا پڑتا ہے۔ پھر اپنی چھوٹی موٹی کمزوریاں جن میں غیر سماجی جسمانی ملاپ بھی شامل ہے اور اچنبھے کی بات یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو دھوکا دینے کی بے پناہ طاقت رکھتے ہیں۔ کسی دوسری عورت کے ساتھ ہم آغوشیوں کے باوجود سمجھتے ہیں کہ ہم پیار اسی پی پی کو کرتے ہیں۔ گویا پی پی کی محبت کے جذبے میں سرشار کسی بھی لڑکی کو ایک بہانہ بنا لیتے ہیں اور یہ سلسلہ بڑا المناک ہوتا ہے

دراصل پوری آزادی کے بنا ہمیں اپنی محبتوں پہ قدرت ہوتی ہے اور نہ نفرتوں پہ اپنا بس چلتا ہے۔ ساری زندگی ایک کھیل سا معلوم ہوتی ہے، ایک گھٹیا سا ناٹک جس میں کام کرنے والا اپنا پارٹ بھولا رہتا ہے اور پس پردہ پرامپٹر کچھ ایسے طریقے سے پارٹ یاد دلاتا ہے کہ سننے والوں کو اس کی آواز بھی سنائی دیتی ہے لیکن وہ ہیں کہ ایک ڈھٹائی کے ساتھ کھیل دیکھتے چلے جاتے ہیں۔ خیر یہ باتیں چھوڑیے۔ میں کبھی اتنی آمدنی ہی نہ پیدا کر سکا کہ کاؤں ——— تزک و احتشام سے کاؤں ——— لوٹ جاؤں اور اب تو پی پی کئی بچوں کی ماں بن چکی ہے۔ کوئی اس کے بارے میں خاموش رہتا تو مجھے اتنا دکھ نہ ہوتا، لیکن ہر سال کوئی نہ

کوئی پہاڑوں سے مجھے ملنے آتا ہے تو جانے کیوں مجھے ہی اذیت دینے کے لئے یہ ضرور کہہ دیتا ہے " وہ مجھ سے پوچھ رہی تھی ۔"
اور میں کہتا ہوں ۔" مجھے کیا ہے ؟ مجھے کیا ہے ؟ مجھے کیا ہے ؟ "
ہاں، تو میں شہر کی بات کر رہا تھا شہر کی ٹریجڈی ان المناک داستانوں سے کہیں زیادہ ہے ۔ان داستانوں میں زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے نا کہ کوئی مر جاتا ہے ، یہاں بھی فاقہ مستی اور تنگ دستی سے مجبور لوگ خودکشی کر لیتے ہیں ۔لیکن ان میں سے اکثر ایسے ہوتے ہیں جو مرنے کے ارادے سے اپنے آپ کو بس کے سامنے گرا دیتے ہیں لیکن تقدیر کا پہیہ کچھ یوں اوپر سے گزر جاتا ہے کہ وہ مرتے نہیں ۔ ان کی ٹانگیں ٹوٹ جاتی ہیں ۔یہاں جو یہ کہہ دے ۔میرے پاس کام نہیں ، وہ سب سے اچھا لیکن ان کا کیا کیجیے جو چھ گھنٹے انتظار کرواتے ہیں اور اس کے بعد ملتے ہیں تو کہتے ہیں اگلے مہینے کی اُنتیس کو ملیے وہ دس تاریخ نہیں کہتے پندرہ بیس نہیں کہتے ، اُنتیس کہتے ہیں اور آپ کو خیال آتا ہے کہ یہ جو طاق قسم کی تاریخ دی ہے اس کا مطلب ہے کام ضرور ملے گا ۔چنانچہ اس خیال سے آپ اپنی تھوڑی بہت پونجی ختم کر دیتے ہیں اور جب اُنتیس تاریخ آتی ہے اور آپ ان

کے پاس جاتے ہیں تو پھر وہ اگلے مہینے کی سترہ تاریخ بناتے ہیں۔ پھر وہی طاق کا عدد۔ لیکن اب آپ کو اس جفت اور طاق کا حساب سمجھ میں آجاتا ہے اور آپ اس سخت سی سیٹ پر نہیں بیٹھتے جو انہوں نے کمرے کے باہر انتظار کرنے والوں کے لئے بنا رکھی ہے اور جس کے نیچے انہوں نے ناریل، سمبل یا اسپرنگ کے بجائے پتھر بھر رکھے ہیں اور آپ کی روح کلبلاتی ہے۔ جب آپ دیکھتے ہیں۔ یہ سلوک آپ ہی سے نہیں ہوتا عورت سے بھی ہوتا ہے جو گھر کی زینت بننے کے بجائے دفتر کی ٹپ ٹپ ہو جانا گوارا کر لیتی ہے اسے بھی ایسا ہی جواب ملتا ہے اور جب وہ مایوس ہو کر لوٹتی ہے تو پیچھے سے کھلی کی آواز آتی ہے اور وہ سنتی ہے کوئی کہہ رہا ہے۔

"کیا بے ہودہ ہے۔"

"سال دو سال پہلے آتی تو معاملہ جمتا۔"

اور پھر کوئی دوسرا مداخلت کرتا۔ "میں اسے جانتا ہوں، چلتی ہے، پیچھے پر ہاتھ رکھ کے دیکھو، جو کبھی انکار کر دے تو کھڑے کھڑے پیشاب سے مونچھیں منڈوا دوں۔"

اور وہی عورت پھر چیل کی طرح پر پھیلاتی، چلاتی شہر کے

بو چیڑ خانوں پہ منڈلاتی ہے، حویلیوں کے منڈیر پر اڑتی ہے، پھر اُڑتی ہے، پھر انسانی چوہوں پر جھپٹتی ہے، انہیں دبوچ کے لے جاتی ہے اور آخر قدر زاید کے بچھونے پہ دم توڑ دیتی ہے۔

چیل سے مجھے یاد آیا۔ میں شہر پہنچا تو لوگوں نے مجھے پہاڑی کوا کہنا شروع کر دیا۔ اس کی تین وجہیں تھیں۔ آخری وجہ تو میں آخر میں بتا دوں گا، پہلی دو سن لیجئے۔ شہر میں آتے سمے مجھے گلپھڑوں کی شکایت تھی۔ یہ بیماری پہاڑوں میں عام ہوتی ہے۔ پہاڑ کے پانی میں جہاں دوسری معدنی چیزیں ہوتی ہیں وہاں آیوڈین کی کمی ہوتی ہے جس کے کارن گلا سوج جاتا ہے۔ چنانچہ ۱۹۲۷ء میں جب میں یہاں آیا تو میرے گلے سے غائیں غائیں کی آواز کے سوا کچھ نہ نکل سکا۔ لوگوں کو اپنے آپ ہی میرے نام کا پتا چل گیا اور انھوں نے مجھے پہاڑی کوا کہنا شروع کر دیا۔ میں پہلے تھوڑا ہنسا، پھر میں نے کہا "یار، دراصل میرا نام ہی یہی ہے" اس پہ وہ بھی ہنسے۔ اس وقت جب میں نے خود ہی اس بات کو تسلیم کر لیا تھا تو میرا خیال تھا یہ لوگ مجھے اس نام سے یاد نہیں کریں گے، وہ مجھے سرب، دیال کوشل ہی کہیں گے، لیکن کچھ دن چپ رہنے کے بعد انھوں نے مجھے میرے پہاڑی کوے کے نام ہی سے

پکارنا شروع کر دیا اور میں اسی پہ شاکر ہو گیا۔ دوسری وجہ یہ تھی۔ کہ شہر کے لوگ مجھ سے جلتے تھے۔ اتنے بڑے شہر میں پہاڑ سے چلے آنے والے ایک آدمی سے کیا فرق پڑتا تھا؟ لیکن جانے کیوں وہاں کے لوگوں کو یہ اچھا نہ لگا کہ میں ان کی کمائی میں حصّہ بٹا لوں انھوں نے میری حیثیت وہی سمجھی جو پہاڑی کوے کی ہوتی ہے جب وہ اپنے ہاں کی سخت سردی سے گھبرا کر میدانوں میں چلا آتا ہے اور وہاں کی گرم، تر اور بیاتی ہوئی زمین سے دانے ٹھونگ کر بڑی تسلّی سے غائب غائب کیا کرتا ہے۔

شہر آکر میں رتن چند کے تالاب پہ رہنے لگا۔ یہ تالاب بھی ایک طرح سے کوشل گورنٹ تھا، یعنی جس کو رہنے کے لئے جگہ نہ ملے وہ رتن چند کے تالاب پہ چلا آئے۔ شہر کے تانگے والے سب جانتے تھے یہ تالاب شاہ عالمی دروازے کے باہر واقع ہے اور سرکلر روڈ پہ ان کی معمول کی گزرگاہ پہ پڑتا ہے۔ گھوڑے تک اس نام کو جانتے تھے۔ اسٹیشن سے باہر آنے والا مسافر ہلکا سا بھی اشارہ کرتا تو تانگے والے گھوڑے کی باگ کھینچ کر چھوڑ دیتے اور انہیں وہ فقرہ "چل اوتے ماں دیا دینیاں"، بھی کہنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ گھوڑا اپنے ڈھیلے ڈھالے اور ٹوٹے پھوٹے ساز میں

یوں مزے سے چلتا جیسے تحصیل کا چپراسی اپنے کڈھب اور ان گھڑ لباس میں چلتا ہے۔ کہیں موچی دروازے کے شروعات اور برانڈرتھ روڈ کے آخر میں گھوڑے کی پیٹی ٹوٹ جاتے۔ جس جگہ تانگے والا اپنا صافہ باندھ دیتا اور یا پھر اس کی کلغی گر جائے جیسے کوچوان کو بھاگ کے لانا پڑتا۔ وہیں سے ایک راستہ بل روڈ کی طرف نکلتا تھا جس کے نکڑ پہ چارہ کاٹنے کی مشین یا سوکھی گھاس ملتی تھی۔ تانگے والے وہاں سے ایک بوری چارے کی ضرور خریدتے اور سواریوں کو بے آرام کرتے ہوئے بوری کو سیٹوں کے نیچے گھسیڑ دیتے اور پھر "ٹا۔۔۔ٹا۔۔۔ہش" کہتے ہوئے چل دیتے۔ شدہ شدہ تانگہ رتن چند کے تالاب پہ پہنچتا۔ جہاں تانگے والے کچھ دیر رک کر سلفے کا کش لگاتے اور پھر "چل اوئے موری، چل اوئے بھاٹی" کہتے ہوئے آگے چلے جاتے۔

اور ہمارا مسافر تالاب پہ اُتر جاتا۔ یہ تالاب کوئی پون سو گز لمبا اور آدھ سو گز چوڑا تھا۔ اس کے چاروں طرف مغلئی قسم کی بارہ دری کے انداز میں چبوترے بنے تھے جن پر ان گنت ستون کھڑے تھے۔ بے رحم، نابالغ ہاتھوں نے ان پہ نام کندہ کر رکھے تھے۔ کہیں کہیں فحش تصویریں بنی تھیں۔ جانے کب سے

بہ ستون ٹوٹی پھوٹی چھتوں کو تھامے کھڑے تھے۔ چونکہ سامنے
اور بغل کی سڑک پہ بے شمار آمد و رفت تھی اس لئے راستے ہی
کی مٹی سے چھت پہ ایک خاصی تہ جم گئی تھی۔ نیچے چبوتروں پہ
رہنے والے تو صفائی کی لاج رکھ لیا کرتے تھے۔ لیکن چھت کو
گندہ رہنے کی آزادی تھی اور اس پہ ایک بے نام سی گھاس اگ
آئی تھی جو اپنے آپ سڑ جاتی اور جب چھینٹا پڑتا تو پھر ایک دم
ہری ہو جاتی یہ سارا کرشمہ موسم کا تھا۔ یہی حالت چبوترے
کے نیچے رہنے والوں کی تھی۔ کبھی انہیں چار پیسے کی آمدنی ہو
جائے تو وہ برسات کے مینڈکوں کی طرح ٹرانے لگتے۔ کسی طرف
سے آواز آ رہی ہے، "تب چلے رام رگھورائی"، اور کوئی ایک دم
پکار اٹھتا:

تو بنہ واجدا ای ناں نانار بناں

رہندی ناں ، یار بناں

لچے، لفنگے، یار، چور، فقیر، اپاہج سب باہر تالاب کے کنارے
پڑے رہتے تھے۔ یہاں بھی چھوٹی اور بڑی ذاتیں تھیں۔ جو بالکل
غریب تھے وہ باہر تالاب اور سڑک کے درمیان سوتے تھے۔ ان
"سپاہیوں"، انہیں رات بھر تنگ کیا کرتے۔ آتے اور اٹھا دیتے

۔نے نہ چھوڑتے اور اب ان کو رات میں دس بار جاگنے اور
،ہی بار سونے کی عادت ہو گئی تھی۔ چار پیسے کمانے والے
ب کے اندرونی احاطے میں سوتے تھے اور اس سے زیادہ
طاعت والے اندر کوٹھریوں میں۔ ساری سردیاں اندر رہتے
پھر گرمیوں میں کوٹھے پہ چلے جاتے۔ ان لوگوں کو اکثر روز پہ
پانی مل جاتی تھی۔ یہ اپنی قسم کے رئیس تھے۔ آنریری مجسٹریٹوں
طرح باقاعدہ کچہری کیا کرتے اور جیسی طبیعت چاہے فیصلہ
کر دیتے جو سب پہ لاگو ہوتا۔ ان غلط یا سچ فیصلوں کا اتنا
حترام کرنا پڑتا جتنا کسی سرکاری عدالت کے فیصلوں کا۔
لمبے چوڑے بکھیڑوں، ذاتوں اور گوتروں کے گنجلک نقوش
اوجود تالاب پہ رہنے والے لوگوں کی ایک ہی ذات تھی۔
ہی گوشل گوت تھی ان کی ــــ افلاس!

